

عصرِ حاضر کے
پُر فریب نعرے

ڈاکٹر محمد رفعت

ترتیب

۹	پیش لفظ
۱۱	عصر حاضر کی اصل گم راہی۔ انکارِ غیب
۱۲	عصر حاضر کی حقیقی ماہیت
۱۴	غیب کا مفہوم
۱۵	انکارِ غیب کی دلیل
۱۷	انبیاء پر اعتماد
۱۹	اجر کا طالب نہ ہونا
۲۱	بعض حقائقِ غیب کا مشاہدہ
۲۲	ایمان بالغیب کی دعوت
۲۵	سیکولرزم اور جمہوریت۔ اسلامی تصورات کے تناظر میں
۲۵	حاکمیتِ الہ
۲۷	قانون سازی
۲۸	برسرِ حق حکومت
۳۰	جمہوریت
۳۰	(الف) عوام کی حاکمیت
۳۱	(ب) عوامی نمائندگی

- ۳۲ (ج) بنیادی حقوق
- ۳۳ (د) پارٹی سسٹم اور امیدواری
- ۳۴ جمہوری رجحان
- ۳۵ سیکولرزم
- ۳۵ (الف) سیکولر فلسفہ
- ۳۶ (ب) سیکولر سوسائٹی
- ۳۷ (ج) سیکولر ریاست
- ۴۰ اسلام، سیکولرزم اور آفاقیت
- ۴۱ آفاقیت
- ۴۲ اسلام کی دعوت
- ۴۶ سیکولرزم کی دعوت
- ۴۹ دعوت کی عالم گیری
- ۵۲ زمانی آفاقیت
- ۵۴ نظریے کی جامعیت
- ۵۷ سیکولرزم: تاریخی اور نفسیاتی تجزیہ
- ۵۹ مذہب اور فطرتِ انسانی
- ۶۰ یورپ کی نشاۃ ثانیہ
- ۶۰ (الف) تثلیث کا تصور
- ۶۰ (ب) اربابِ مذہب کا گروہ
- ۶۱ (ج) رہبانیت
- ۶۲ (د) غیر عملی اخلاقی اقدار

۵	عصر حاضر کے پُر فریب نعرے
۶۲	(۵) شریعت کی منسوخی
۶۳	(۶) کفارہ
۶۳	ردِ عمل
۶۴	سیکولرزم کی ابتدا
۶۴	فطری تقاضوں کا باہم ٹکراؤ
۶۶	سمجھوتہ
۶۶	سیکولرزم کے دو مفہوم
۶۷	انسانی فطرت کا سیکولر تصور
۶۸	سیکولرزم اور اسلام
۶۸	سیکولر اسٹیٹ
۷۰	سیکولر نیشن اسٹیٹ کی پیچیدگی
۷۱	ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ
۷۳	سیکولر اسٹیٹ نہ ہو تو کیا ہو؟
۷۵	جارحانہ قوم پرستی - ایک تجزیہ
۷۶	قوم پرستی کی دلیل
۷۶	وسیع تر منصوبہ
۷۷	نفوذ کا طریق کار
۷۹	سیکولرزم کی تعبیر
۸۰	درست ردِ عمل
۸۲	اللہ کی طرف دعوت
۸۴	انسانی آزادی کا تحفظ
۸۵	انسانی آزادی کا مفہوم

- ۸۷ متکبرین کا رویہ
- ۹۲ کثرتیت اور اقامتِ دین
- ۹۲ کثرتیت کی اصطلاح
- ۹۵ کثرتیت کا مفہوم
- ۹۷ اقامتِ دین
- ۹۹ رواداری
- ۱۰۱ تہذیبی آزادی
- ۱۰۳ تنوع کی حیثیت
- ۱۰۷ سماجی تنوع اور اس کے تقاضے
- ۱۰۷ لغوی مفہوم
- ۱۰۹ کثرتیت - ایک واقعہ
- ۱۱۱ کثرتیت بہ طور رویہ
- ۱۱۳ رنگ و نسل کے تنوع کی حکمت
- ۱۱۴ اسلامی معاشرہ میں مختلف نسلوں کا تعاون باہمی
- ۱۱۵ دین اور عقیدے کا تنوع محض گوارا ہے، مستحسن نہیں
- ۱۱۶ رواداری
- ۱۱۷ مظاہر کا تنوع
- ۱۱۸ مکاتب فکر
- ۱۱۹ سرودھرم سمبھاؤ
- ۱۲۱ مذہب اور اس کے علم بردار
- ۱۲۲ بنیادی نکات

- ۱۲۳ دھرم اور سمجھاؤ کے معنی
- ۱۲۳ تصور وحدتِ ادیان کا محرک
- ۱۲۵ کیا مذاہب کے اختلافات فروعی ہیں؟
- ۱۲۸ مذہب پر ایویٹ معاملہ نہیں ہے
- ۱۲۹ بقائے باہم کا معاملہ
- ۱۳۲ غیر مسلم افراد کے ساتھ حسنِ معاملت
- ۱۳۴ راست اسلوبِ دعوت کی ضرورت
- ۱۳۴ ڈائلاگ کا مفہوم
- ۱۳۵ ڈائلاگ یا دعوت؟
- ۱۳۷ مباحثہ
- ۱۳۸ دین کا موضوع
- ۱۴۰ حاملینِ کتاب کی ذمہ داری
- ۱۴۱ کلمہ سوا
- ۱۴۳ مغربی اصطلاحات سے اجتناب

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پیش لفظ

گزشتہ چند صدیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جہاں ایک طرف مسلمانوں پر غلبہ و تسلط حاصل کرنے کے لیے جبر و استبداد کا سہارا لیا گیا، مسلم ممالک پر فوج کشی کر کے ان پر قبضہ جمالیا گیا اور مسلم عوام کی جانوں اور مملوکہ چیزوں کو بری طرح پامال کیا گیا، وہیں دوسری طرف ان پر فکری یلغار بھی کی گئی۔ اسلام پر دہشت گردی، انتہا پسندی، بنیاد پرستی، قدامت پسندی اور دیگر الزامات لگائے گئے اور اس کے مقابلے میں بعض نظریات گھڑ کر انھیں زیادہ سائنٹفک، موجودہ دور سے زیادہ ہم آہنگ اور زیادہ قابل عمل قرار دیا گیا۔ مثلاً کثرتیت (Pluralism)، وحدتِ ادیان (سرودھرم سمبھاؤ)، لامذہبیت (Secularism)، حاکمیتِ جمہور، قوم پرستی وغیرہ۔ کہنے کو تو یہ چند اصطلاحات ہیں، لیکن ان کے پیچھے پورا نظامِ فکر و فلسفہ پوشیدہ ہے۔ حقیقت میں یہ موجودہ دور کے پُر فریب نعرے ہیں، جن کی گونج پوری دنیا میں سنائی دے رہی ہے اور خاص طور سے ہمارے ملک عزیز میں بھی ان کا غلغلہ بلند ہے۔ ضرورت ہے کہ ان نظریات کا علمی انداز میں محاکمہ کیا جائے، ان کے تضادات واضح کیے جائیں، ان کی کم زوریوں کو واضح کیا جائے اور اسلامی نظریہ حیات کی ایسی دل نشیں تشریح و تفہیم کی جائے کہ ان نظریات کے مقابلے میں اس کی برتری ثابت ہو اور وہ موجودہ دور میں بھی لائق عمل، قابل قبول اور قرین عقل معلوم ہو۔

زیر نظر کتاب دس (۱۰) مضامین پر مشتمل ہے۔ ان میں مذکورہ بالا نظریات سے بحث کی گئی ہے، ان کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور تجزیہ کیا گیا ہے اور اسلام سے ان کا تقابل کر کے اسلامی تصورات کی معقولیت اور برتری ثابت کی گئی ہے۔ یہ مضامین اصلاً ماہ نامہ زندگی نونئی دہلی کے

عصر حاضر کے پرفریب نعرے

اداریوں (اشارات) کی حیثیت سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ عمومی افادیت کے پیش نظر اب انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے، علمی و دینی حلقوں میں اس کتاب کو مقبولیت حاصل ہوگی اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا جائے گا۔

محمد رضی الاسلام ندوی

۲۲/ جمادی الاخریٰ ۱۴۳۶ھ

سکریٹری تصنیفی اکیڈمی، جماعت اسلامی ہند، نئی دہلی

۱۲/ اپریل ۲۰۱۵ء

عصرِ حاضر کی اصل گم راہی: انکارِ غیب

’عصرِ حاضر کیا ہے؟‘ اس سوال پر متعدد پہلوؤں سے غور کیا جاسکتا ہے۔ ایک اعتبار سے عصرِ حاضر ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کا دور ہے اور یہی اس عہد کی اصل امتیازی خصوصیت ہے۔ بعض تجزیہ کرنے والے ٹکنالوجی کی اس ترقی کے چند اہم عناصر کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ مثلاً الیکٹرانک ٹکنالوجی، ابلاغ کی تکنیک، خلائی ٹکنالوجی، نیوکلیئر ٹکنالوجی، ذرائع آمد و رفت، کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور جدید اسلحہ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ٹکنالوجی کی یہ غیر معمولی ترقی اپنے ساتھ کوئی چیلنج بھی لائی ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ ٹکنالوجی کی اس ترقی کے ساتھ تین بڑے چیلنج سامنے آئے ہیں: (الف) ٹکنالوجی کے ضرورت سے زیادہ استعمال کا چیلنج (جسے ٹکنالوجی کا ”نشہ“ یا ”لت“ Addiction کہا جاسکتا ہے)۔ (ب) ٹکنالوجی کی بنا پر طاقت ور اور کم زور کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کا چیلنج اور (ج) ٹکنالوجی کی روز افزوں ترقی کی وجہ سے قدرتی نظام کے توازن میں خلل اور آلودگی کا مسئلہ۔

’عصرِ حاضر کیا ہے؟‘ اس سوال کے ایک جواب کا اوپر تذکرہ کیا گیا، وہ یہ کہ عصرِ حاضر ’ٹکنالوجی کا دور‘ ہے۔ اس کا ایک اور جواب یہ ہے کہ عصرِ حاضر گلوبلائزیشن کا دور ہے۔ اس دور میں دنیا سکر کر ایک بستی بن گئی ہے۔ چنانچہ ملکوں اور قوموں کے درمیان سرحدوں کی موجودگی کے باوجود ایک دوسرے سے اُن کا ارتباط اس درجے بڑھ چکا ہے کہ کوئی ملک عالمی تبدیلیوں سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ گلوبلائزیشن کے اس مظہر نے بھی نئے چیلنج پیدا کیے ہیں۔ ان میں تین چیلنج بنیادی ہیں: پہلا چیلنج یہ ہے کہ دنیا بہت عرصے تک الگ الگ سیاسی یونٹوں میں منقسم نہیں رہ سکتی۔ اُس کو

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

ایک عالمی ریاست بننا ہوگا۔ اس عالمی ریاست کی فکری بنیادیں کیا ہوں گی؟ یہ ایک حل طلب سوال ہے۔ دوسرا چیلنج یہ ہے کہ جب تک یہ عالمی ریاست وجود میں نہ آئے، اس وقت تک ایک صاف ستھرے مبنی بر انصاف بین الاقوامی قانون کی ضرورت ہے، جو ملکوں کو ایک دوسرے کے حقوق کا احترام سکھائے۔ یہ قانون کیسے مرتب کیا جائے اور اس کے لیے درکار قوت نافذہ کہاں سے آئے گی؟ تیسرا چیلنج یہ ہے کہ قدرتی ماحول کے توازن کو کیسے بحال کیا جائے اور توازن کی بحالی کے اس مشکل کام میں روئے زمین کی تمام قوموں اور ملکوں کا تعاون کیسے حاصل کیا جائے؟

عصر حاضر کی حقیقی ماہیت

’عصر حاضر کیا ہے؟‘ اس سوال کے دو مقبول ترین جوابات آپ کے سامنے آئے۔ ایک جواب یہ ہے کہ عصر حاضر کی اصل خاصیت ٹکنالوجی کا غیر معمولی ’عروج‘ ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ عصر حاضر کی اصل روح ’گلوبلائزیشن‘ ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں جوابات جزوی طور پر صحیح ہیں، یعنی یہ عصر حاضر کے ظاہری پہلوؤں میں سے دو نمایاں ترین پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ لیکن عصر حاضر کی اصل حقیقت دریافت کرنے کے لیے ہمیں محض اس کے ظاہر کا تجزیہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اُن افکار و خیالات کا گہرا جائزہ لینا چاہیے، جن سے عصر حاضر کی تشکیل ہوئی ہے۔ زندگی، تمدن اور تہذیب کا ظاہری ڈھانچہ بلاشبہ اہمیت رکھتا ہے، لیکن اس کی حیثیت صرف قالب کی ہے، اس کے اندر جو روح موجود ہے وہ افکار و خیالات کی روح ہے۔ چنانچہ عصر حاضر کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ وہ تصورات کون سے ہیں جن کی بنیاد پر عصر حاضر کی غالب تہذیب — مغربی تہذیب — کی تعمیر ہوئی ہے؟

مغربی تہذیب کے افکار و نظریات بہت سے ہیں۔ فلسفے میں ہیومنزم (Humanism)

اور وجودیت (Existentialism) اجتماعیات میں سیکولرزم اور جمہوریت، اخلاقیات میں افادیت (Utilitarianism) اور اضافیت (Relativism)، معاشیات میں آزاد مسابقت (Free Competition)، تصور کائنات میں مادیت (Materialism) اور بخت و اتفاق (Chance) اور جان داروں کی دنیا میں نظریہ ارتقاء (Evolution) اس تہذیب کے مشہور

نظریات ہیں۔ ان نظریات میں باہم بہت سے اختلافات ہیں، لیکن ان سب کے درمیان ایک مشترکہ رجحان (Common Trend) موجود ہے جس کو سادہ الفاظ میں ’غیب کا انکار‘ کہا جاسکتا ہے۔

’غیب کے انکار‘ کے رجحان کے اتباع میں جو نقطہ نظر وجود میں آیا ہے، اُسے آج کل ’سائنسی نقطہ نظر‘ کہا جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق ”حقیقت صرف وہ ہے، جسے انسان اپنے حواس کی مدد سے اپنی گرفت میں لے سکے، جو دیکھی جاسکے، سنی جاسکے اور جس کی پیمائش ہو سکے۔“ اگر کوئی چیز اس قسم کی نہیں ہے تو پھر وہ حقیقت نہیں ہے، بلکہ محض واہمہ ہے۔ سائنسی نقطہ نظر (Scientific World View) کے مطابق معلومات کی فراہمی کے لیے ایک سائنسی طریق کار (Scientific Method) بھی تجویز کیا گیا ہے۔ وہ طریق کار یہ ہے کہ انسان اپنے حواس کی مدد سے معلومات اکٹھا کرے اور پھر اپنی استدلالی قوتوں سے کام لے کر ان معلومات کو منظم انداز میں مرتب کرے۔ اس طریقے کے علاوہ کسی اور منہج کو مستند تسلیم نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ ’عصر حاضر کیا ہے؟‘ اس سوال کا حقیقی جواب یہ ہے کہ ”عصر حاضر اجتماعی زندگی کی اُس شکل سے عبارت ہے جو غیب کے انکار کی بنیاد پر قائم ہے۔“

یہ ایک پہلو سے منفی جواب ہے۔ اگر اس سوال کا مثبت جواب دیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ”عصر حاضر سائنسی نقطہ نظر کے مطابق انسانی زندگی کی تنظیم کا نام ہے۔“

ظاہر ہے کہ غیب کے انکار کا یہ اساسی رجحان، جو عصر حاضر کی روح ہے، انبیائی تعلیمات کے لیے ایک چیلنج ہے، اس لیے کہ انبیائی تعلیم کی اساس ہی یہ ہے کہ ”امورِ غیب پر ایمان“ لایا جائے۔ نبی کریم ﷺ نے جو تعلیمات اپنے قول و عمل سے پیش کی ہیں، اُن میں ہمیں عصر حاضر کے اس چیلنج کا جواب ملتا ہے۔ آپ پر ایمان لانے والوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس چیلنج کو قبول کریں اور انسانوں کو اس مقبول عام گم راہی سے نجات دلائیں۔ ’غیب کے انکار‘ کے اس غلط رجحان کا مقابلہ عقلی و استدلالی سطح پر بھی کیا جانا چاہیے اور نفسیاتی و جذباتی سطح پر بھی، لیکن اس سے قبل یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ’غیب‘ سے مراد کیا ہے؟

غیب کا مفہوم

سورہ فاتحہ کے فوراً بعد قرآن مجید میں اُن لوگوں کا تعارف کرایا گیا ہے، جو اس کتاب سے ہدایت پاسکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر ہدایت یابی کے لیے ضروری شرائط بیان کر دی گئی ہیں:

اَلَمْ ۙ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۙ فِيْهِ ۙ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ
يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۙ وَبِالْآخِرَةِ
هُمْ يُوقِنُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (البقرة: ۱-۵)

”الف۔ لام۔ میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے اُن پر ہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئی تھیں، اُن سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہِ راست پر ہیں اور وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

ان آیات میں ہدایت پانے کے لیے چھ (۶) شرائط کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ تقویٰ، غیب پر ایمان، اقامتِ صلوٰۃ، اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے خرچ کرنا، اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان اور آخرت پر یقین۔ ان میں دوسری شرط ’غیب پر ایمان‘ ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ آیات بالا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”غیب سے مراد وہ حقیقتیں ہیں جو انسان کے حواس سے پوشیدہ ہیں اور کبھی بہ راہِ راست عام انسانوں کے تجربہ و مشاہدہ میں نہیں آتیں، مثلاً خدا کی ذات و صفات، ملائکہ، وحی، جنت، دوزخ وغیرہ۔ ان حقیقتوں کو بغیر دیکھے ماننا اور اس اعتماد پر ماننا کہ نبی ان کی خبر

دے رہا ہے، ایمان بالغیب ہے۔ جو شخص ان غیر محسوس حقیقتوں کو ماننے کے لیے تیار ہو، صرف وہی قرآن کی رہ نمائی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ راہ وہ شخص جو ماننے کے لیے دیکھنے اور چکھنے اور سونگھنے کی شرط لگائے اور جو کہے کہ میں کسی ایسی چیز کو نہیں مان سکتا جو ناپی اور تولی نہ جاسکتی ہو، تو وہ اس کتاب سے ہدایت نہیں پاسکتا۔“

(تفہیم القرآن، سورہ بقرہ، حاشیہ: ۴)

انکارِ غیب کی دلیل

غیب کا مفہوم جان لینے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ’غیب‘ موجود نہیں ہے، اُن کے اس دعوے کے دلائل کیا ہیں؟

اس سوال کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ منکرینِ غیب کے پاس اپنے موقف کے لیے ’دلائل‘ موجود نہیں ہیں۔ بلکہ صرف ایک ’دلیل‘ ہے، وہ یہ کہ ”جن امور کو غیب کہا جاتا ہے (مثلاً ملائکہ، وحی، جنت، دوزخ وغیرہ) وہ چوں کہ ہمیں نظر نہیں آتے، اس لیے موجود نہیں ہیں۔“

لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا مندرجہ بالا بیان فی الواقع کوئی دلیل ہے، یا محض ایک دعویٰ ہے جو خود دلیل کا محتاج ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ سائنسی نقطہ نظر کے قائلین خود ایسی بہت سی چیزوں کے قائل ہیں جو انسانی حواس کے ذریعے کیے گئے، مشاہدے کی گرفت میں نہیں آتیں، لیکن اُن کے وجود کو محض عقلی استدلال کی وجہ سے مان لیا جاتا ہے۔ مثلاً:

(الف) سائنسی نقطہ نظر کے حاملین عام طور پر اس بات کے قائل ہیں کہ کائنات کے مختلف اجزاء کے درمیان کشش اور انجذاب جیسی طاقتیں موجود ہیں، جو ان اجزاء کو باہم وابستہ رکھتی ہیں اور کائنات میں ہونے والی تبدیلیوں کا سبب ہیں۔ لیکن ان طاقتوں کا بہ راہِ راست مشاہدہ کسی انسان نے نہیں کیا، محض ان کے مظاہر اور اثرات کو دیکھا ہے۔

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

(ب) سب جانتے ہیں کہ کائنات میں کچھ اشیاء جان دار ہیں اور کچھ غیر جان دار، لیکن جان یا زندگی کا براہ راست مشاہدہ کسی نے نہیں کیا۔ جب جان نکل جاتی ہے تو ایک ذی روح مرجاتا ہے اور پھر اس کے بچے کچھے ڈھانچے کی خصوصیات وہی ہوتی ہیں جو عام بے جان اشیاء کی ہوا کرتی ہیں۔ جس طرح ہم پانی کی بوتل سے پانی نکلتے ہوئے دیکھتے ہیں، اسی طرح کسی ذی روح کے مرتے وقت اُس کے جسم سے جان نکلتے ہوئے نہیں دیکھتے، لیکن اس عدم مشاہدہ کے باوجود نہ کوئی 'جان' کا انکار کر سکتا ہے نہ 'جان کے نکلنے' کا۔

(ج) عموماً اہل سائنس اس کے قائل ہیں کہ کائنات قوانین کی پابند ہے، لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں، قانونِ فطرت بہ ہر حال کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قابلِ مشاہدہ ہو۔ صرف قوانین کے مظاہر کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انکارِ غیب کا موقف درحقیقت بہت کم زور ہے اور اس کے حق میں کوئی واقعی دلیل موجود نہیں ہے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلامِ الہی انسانوں کے سامنے پیش کیا اس میں انکارِ غیب کی اس دلیل (عدمِ مشاہدہ) کی کسی تردید کی ضرورت نہیں محسوس کی گئی۔ البتہ اس امر کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ انسانوں کا موت پر قابو نہ پاسکنا عالمِ غیب کی موجودگی پر صاف دلالت کرتا ہے:

فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومَ ۖ وَأَنْتُمْ حِينِيذٍ تَنْظُرُونَ ۖ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ ۖ وَلَكِنْ لَا تُبْصِرُونَ ۖ فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۖ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۖ (الواقعة: ۸۳-۸۷)

”اب اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو اور اپنے اس خیال میں سچے ہو تو جب مرنے والے کی جان حلق تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور تم آنکھوں دیکھ رہے ہوتے ہو کہ وہ مر رہا ہے، اُس وقت اُس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے؟ اس وقت تمہاری نسبت ہم اُس سے زیادہ قریب ہوتے ہیں، مگر تم کو نظر نہیں آتے۔“

انکارِ غیب کے موقف کی کم زوری سامنے آچکی ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو غیب پر ایمان کے مثبت دلائل بھی موجود ہیں۔ نبی کریم ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب — قرآن مجید — ایمان بالغیب کے لیے مثبت بنیادیں فراہم کرتی ہے۔ انبیاء پر اعتماد ایسی ہی مثبت بنیاد ہے۔

انبیاء پر اعتماد

انسان ہمیشہ امورِ غیب کے بارے میں جاننے کا خواہش مند رہا ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ خالق کائنات کون ہے؟ اُس کی صفات کیا ہیں؟ اور اُس کا اپنے بندوں سے کیا تعلق ہے؟ ملائکہ کون ہیں اور اُن کی خصوصیات کیا ہیں؟ وحی کی کیفیت کیا ہے؟ عالمِ آخرت میں انسان کو کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے؟ ان سوالات کا اور اس طرح کے دیگر سوالات کا جواب ہمیں انبیائی تعلیمات میں ملتا ہے۔ لیکن انبیائی تعلیمات پر غور سے پہلے ایک اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ انسان انبیاء کی بات اطمینان کے ساتھ کیوں مان لے؟

قرآن مجید نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سچے اور دیانت دار انسان ہوتے ہیں، وہ جھوٹ نہیں بولتے، اس لیے اُن کی دوسری باتوں کی طرح اُن کا دعویٰ نبوت بھی سچا ہے۔ اُن کی صداقت و دیانت پر اُن کی قبل از نبوت کی پوری زندگی گواہ ہوتی ہے:

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ ۚ قَالَ الَّذِينَ لَا يَرْجُونَ لِقَاءَنَا
 أَنْتَ بَقْرَانٍ غَيْرِ هَذَا أَوْ بَدَّلَهُ ۚ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَبَدِّلَهُ مِنْ
 تِلْقَائِي نَفْسِي ۚ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوْحَىٰ إِلَيَّ ۚ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ
 رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا
 أَدْرَاكُمْ بِهِ ۚ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا ۚ مِنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝
 مَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا أَوْ كَذَّبَ بِآيَاتِهِ ۚ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ
 الْمُجْرِمُونَ ۝

(یونس: ۱۵-۱۷)

”جب انہیں ہماری صاف صاف باتیں سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی

توقع نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ ”اس کے بجائے کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں کچھ ترمیم کرو۔“ اے نبی! ان سے کہو: ”میرا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے اس میں کوئی تغیر و تبدل کر لوں۔ میں تو بس اس وحی کا پیرو ہوں جو میرے پاس بھیجی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔“ اور کہو: ”اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو میں یہ قرآن تمہیں کبھی نہ سنا تا اور اللہ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر اس سے پہلے میں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔ پھر اُس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو ایک جھوٹی بات گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرے یا اللہ کی واقعی آیات کو جھوٹا قرار دے۔ یقیناً مجرم کبھی فلاح نہیں پاسکتے۔“

ایک شخص یہ بات سن کر کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے ایک شخص صادق و امانت دار ہو، لیکن اس کی عقل متاثر ہوگئی ہو اور وہ نا سمجھی کی باتیں کرنے لگا ہو۔ قرآن مجید نے اپنے مخاطبین کو اس امکان پر بھی غور کرنے کی دعوت دی ہے اور پوری قوت کے ساتھ کہا ہے کہ مدعی نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی عاقل و دانا انسان ہیں۔ اُن کے اندر بے عقلی یا نا سمجھی کا کوئی شائبہ تک نہیں ہے۔ تم اس پہلو سے اُن کے متعلق خوب چھان بین کر سکتے ہو۔ تم اُن کو ایک انتہائی فہیم اور سمجھ دار شخصیت پاؤ گے:

قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ ۖ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مِثْلَىٰ خُفٍّ ۚ فَرَأَىٰ ثُمَّ
تَتَفَكَّرُونَ ۗ مَا بِصَاحِبِكُمْ مِنْ جِنَّةٍ ۚ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُمْ بَيْنَ
يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ ۝ (سباء: ۴۶)

”اے نبی! ان سے کہو کہ ”میں تمہیں بس ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں۔ خدا کے لیے تم اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اپنا دماغ لڑاؤ اور سوچو، تمہارے صاحب میں آخر کون سی بات ہے جو جنوں کی ہو؟ وہ تو ایک سخت عذاب کی آمد سے پہلے تم کو متنبہ کرنے والا ہے۔“

مولانا مودودیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

”یعنی اغراض و خواہشات اور تعصبات سے پاک ہو کر خالصتاً اللہ غور کرو۔ ہر شخص الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ سوچے اور دو دو چار چار آدمی سر جوڑ کر بھی بے لاگ طریقے سے ایک دوسرے کے ساتھ بحث کر کے تحقیق کریں کہ آخر وہ کیا بات ہے جس کی بنا پر آج تم اُس شخص کو مجنون ٹھہرا رہے ہو جسے کل تک تم اپنے درمیان نہایت دانا آدمی سمجھتے تھے۔ آخر نبوت سے تھوڑی مدت پہلے کا تو واقعہ تھا کہ تعمیر کعبہ کے بعد حجر اسود نصب کرنے کے مسئلے پر جب قبائل قریش باہم لڑ پڑے تھے تو تم ہی لوگوں نے بالاتفاق محمد مصطفیٰ کو حکم تسلیم کیا تھا اور انھوں نے ایسے طریقے سے اس جھگڑے کو چکایا تھا جس پر تم سب مطمئن ہو گئے تھے۔ جس شخص کی عقل و دانش کا یہ تجربہ تمہاری ساری قوم کو ہو چکا ہے، اب کیا ایسی بات ہوگئی کہ تم اسے مجنون کہنے لگے؟ ہٹ دھرمی اور ضد کی بات تو دوسری ہے، مگر کیا واقعی تم اپنے دلوں میں بھی وہی کچھ سمجھتے ہو جو اپنی زبانوں سے کہتے ہو؟“

(تفہیم القرآن، سورہ سبا، حاشیہ ۶۶)

اجر کا طالب نہ ہونا

یہ بات ہمارے سامنے آچکی ہے کہ انبیاء کا صادق و امانت دار ہونا اور عقل و دانائی میں کامل ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ چنانچہ امور غیب کے بارے میں اُن کی بیان کردہ خبروں پر شک کرنے کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔ البتہ ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کے یہ نیک بندے شروع میں بلاشبہ بے داغ کردار کے مالک تھے، لیکن ہو سکتا ہے بعد میں وہ اپنی کسی غرض کی بنا پر کچھ باتیں گھڑ کر لے آئے ہوں اور انہیں حقائق کے طور پر پیش کرنے لگے ہوں۔

قرآن مجید ہمیں اس امکان پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خوب باریک بینی کے ساتھ انبیاء کی سیرت کا جائزہ لو۔ تم کسی ایسی ’غرض‘ کی نشان دہی نہیں کر سکتے جس کے لیے انبیاء کام کر رہے ہوں۔ وہ انسانوں سے کسی بھی قسم کے ’اجر‘ کے طالب نہیں ہوتے:

وَالِی عَادِ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ یَقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَکُمْ وِّنِ الْاِلٰہِ

غَيْرُهُ إِن أَنْتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ۝ يَقُولُ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِن
أَجْرِي إِلَّا عَلَى الَّذِي فَطَرَنِي أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝ (ہود: ۵۰، ۵۱)

”اور عادی طرف ہم نے اُن کے بھائی ہود کو بھیجا۔ اس نے کہا: ”اے برادرانِ قوم! اللہ کی بندگی کرو۔ تمہارا کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے۔ تم نے محض جھوٹ گھڑ رکھے ہیں۔ اے برادرانِ قوم! اس کام پر میں تم سے کوئی اجر نہیں چاہتا۔ میرا اجر تو اس کے ذمہ ہے، جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تم عقل سے ذرا کام نہیں لیتے۔“

أَمْ تَسْأَلُهُمْ خَرْجًا فَخَرَّاجُ رَبِّكَ خَيْرٌ ۖ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ۝ وَإِنَّكَ
لَتَدْعُوهُمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ۝ (المومنون: ۷۲، ۷۳)

”اے نبی! کیا آپ اُن سے کچھ مانگ رہے ہیں؟ آپ کے لیے تو آپ کے رب کا دیا ہوا ہی بہتر ہے اور وہ بہترین رازق ہے۔ اور (واقعہ یہ ہے کہ) آپ تو اُن کو سیدھے راستے کی طرف بلا رہے ہیں۔“

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مُبَشِّرًا وَنَذِيرًا ۝ قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ
أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝ (الفرقان: ۵۶، ۵۷)

”اے نبی! تم کو تو ہم نے بس ایک بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ میری اجر تو بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کر لے۔“

اس طرح قرآن اپنی حجت تمام کرتا ہے۔ جو نیک نفس انسان سچے اور امانت دار بھی ہوں، عقل اور دانائی میں بھی کامل ہوں اور اپنی کوئی ذاتی غرض بھی نہ رکھتے ہوں، اُن کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ چنانچہ انبیاءِ امورِ غیب کے بارے میں جو کچھ بتاتے ہیں، اُس پر ایمان لانا عقل کا عین تقاضا ہے۔

بعض حقائقِ غیب کا مشاہدہ

مندرجہ بالا دلائل کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو بعض حقائقِ غیب کا مشاہدہ بھی کرا دیتا تھا، تاکہ وہ پورے اطمینان کے ساتھ لوگوں کو امورِ غیب کے بارے میں بتا سکیں اور اُن سے ایمان بالغیب کا مطالبہ کر سکیں۔ چنانچہ قرآن اُس موقعے کا تذکرہ کرتا ہے، جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل فرشتے کو دیکھا اور انھوں نے اللہ کی وحی آپ تک پہنچائی:

إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۖ عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ ۖ ذُو مِرَّةٍ ۖ فَاسْتَوَىٰ ۖ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ ۖ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّىٰ ۖ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ ۖ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۖ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ ۖ أَفَتَحْمُرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ ۖ وَلَقَدْ رَأَاهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ ۖ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ ۖ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوَىٰ ۖ إِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشَىٰ ۖ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ ۖ لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ ۖ (النجم: ۳-۱۸)

”یہ تو ایک وحی ہے جو اُس پر نازل کی جاتی ہے۔ اسے زبردست قوت والے نے تعلیم دی ہے (یعنی جبریل امین نے)۔ وہ سامنے آکھڑا ہوا جب کہ وہ بالائی افق پر تھا۔ پھر قریب آیا اور اوپر معلق ہو گیا۔ یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ تب اُس نے اللہ کے بندے پر وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی۔ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اُس میں جھوٹ نہ ملایا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو، جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور ایک مرتبہ پھر اُس نے سدرۃ المنتہی کے پاس اس کو اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنت الماویٰ ہے۔ اُس وقت سدرہ پر چھار ہاتھ جو کچھ کہ چھار ہاتھ۔ نگاہ نہ چوندھیائی نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اُس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔“

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

واقعہ معراج کے موقع پر نبی ﷺ نے بہت سے امورِ غیب کا مشاہدہ کیا:
 سُبْحَنَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى
 الْمَسْجِدِ الْأَقْصَا الَّذِي بَرَكْنَا حَوْلَهُ لِنُرِيَهُ مِنَ الْآيَاتِ ۚ إِنَّهُ هُوَ
 السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ○ (بنی اسرائیل: ۱)

”پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے دور کی اُس مسجد تک
 جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے، تاکہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ
 کرائے۔ حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا۔“

ایمان بالغیب کی دعوت

عصر حاضر کے چیلنج کی نوعیت سمجھ لینے کے بعد اُمتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ
 سارے انسانوں کو عموماً اور اہل مغرب کو خصوصاً ’غیب پر ایمان لانے‘ کی دعوت دے۔ یہ
 واقعہ ہے کہ غیب پر ایمان سے جو چیز اہل مغرب کو روکتی ہے وہ کوئی عقلی استدلال نہیں ہے، بلکہ
 ’مذہب کا خوف‘ ہے۔ اُن کے نزدیک مذہب نام ہے اندھ و شواہ کا، بے بنیاد عقائد کا، ادھام و
 خرافات کا، نامعقول رسوم و رواج کا، پجاریوں اور پروہتوں کی انسانوں پر حکومت کا اور
 غیر منصفانہ قوانین کا۔ اگر ایسے ’مذہب‘ سے وہ نہ بھاگیں تو کیا کریں۔

ایسے حالات میں اہل مغرب کو یہ بتایا جانا چاہیے کہ اسلام اُس قسم کا ’مذہب‘ نہیں ہے
 جس سے وہ خوف زدہ ہیں۔ اُس نے جن باتوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے، وہ انتہائی معقول
 ہیں اور انسانی فطرت کو اپیل کرتی ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَى
 رَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي آتَيْنَاكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَنْ يَكْفُرْ بِاللَّهِ
 وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا
 بَعِيدًا ○ (النساء: ۱۳۶)

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے اور جس نے اللہ اور اُس کے ملائکہ اور اُس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا وہ گم راہی میں بھٹک کر بہت دور نکل گیا۔“

اسلام میں کسی ایسے مذہبی اجارہ دار طبقے (Clergy) کی کوئی گنجائش نہیں، جو اللہ کی ہدایت کی من مانی تشریح کرنے کا اختیار رکھتا ہو:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۚ فَوَيْلٌ لِلَّذِينَ يَكْتُمُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَذَا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ لِيُشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ أَيْدِيهِمْ وَوَيْلٌ لَهُمْ مِمَّا يَكْسِبُونَ ۝ (البقرة: ۷۸، ۷۹)

”اُن میں ایک گروہ امیوں کا ہے جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں، بس اپنی بے بنیاد امیدوں اور آرزوؤں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔ پس ہلاکت اور تباہی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں، پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے، تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ اُن کے ہاتھوں کا یہ لکھا ہوا بھی اُن کے لیے تباہی کا سامان ہے اور اُن کی یہ کمائی بھی اُن کے لیے موجبِ ہلاکت۔“

آخر میں اہل مغرب کو یہ بھی بتایا جانا چاہیے کہ نبی کریم ﷺ کی آمد کی ایک غرض یہ ہے کہ دنیا سے تمام نامعقول رسوم و رواج کا اور غیر منصفانہ قوانین کا خاتمہ کر دیا جائے:

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَهُوَ يُجِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ

وَعَزَّوْهُ وَنَصْرُوهُ وَاتَّبِعُوا الْتَوْرَ الَّذِي أُنْزِلَ مَعَهُ ۚ وَلَكُمْ هُمُ
الْمُفْلِحُونَ ۝

(الاعراف: ۱۵۷)

” (آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر نبی اُمّی (ﷺ) کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں توریت اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے۔ وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک چیزیں حلال اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور اُن پر سے وہ بوجھ اُتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہذا جو لوگ اس پر ایمان لائیں اور اُس کی حمایت اور نصرت کریں اور اُس روشنی کی پیروی اختیار کریں جو اُس کے ساتھ نازل کی گئی ہے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔“

سیکولرزم اور جمہوریت اسلامی تصورات کے تناظر میں

موجودہ دور کے دو مقبول ترین نعرے سیکولرزم اور جمہوریت ہیں۔ یوں تو ان کا تعلق زندگی کے بہت سے گوشوں سے ہے، لیکن بالخصوص سیاسی و اجتماعی زندگی پر ان تصورات نے گہرے اثرات ڈالے ہیں۔ اسلامی افکار کی روشنی میں ان کے تنقیدی مطالعے سے قبل ضروری ہے کہ خود اسلام کے سیاسی نقطہ نظر کو سمجھ لیا جائے۔ اسلام کے نقطہ نظر کو حاکمیت، قانون سازی اور برسرِ حق حکومت کی اصطلاحات کے تحت بیان کیا جاسکتا ہے۔

حاکمیتِ الہ

اپنے سلسلہ مضامین ’اسلامی ریاست‘ میں اسلام کی سیاسی تعلیمات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

”قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے، خلق اسی کی ہے، لہذا فطرنا امر کا حق (Right to Rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی خلق پر خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے۔ صحیح راستہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ اس کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت میں اس کے قانون شرعی کے مطابق حکم رانی ہو اور فیصلے کیے جائیں:

قُلِ اللَّهُمَّ مَلِكُ الْمَلِكِ تُؤْتِي الْمَلِكَ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمَلِكَ
مِنْ تَشَاءُ وَتَعَزُّ مِنْ تَشَاءُ وَتَنْزِلُ مِنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ (آل عمران: ۶۲)

”کہو اے اللہ، مالک الملک! تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔“

ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمَلِكُ (فاطر: ۱۳)

”وہ ہے اللہ تمہارا رب، ملک اسی کا ہے۔“

لَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيكٌ فِي الْمَلِكِ (بنی اسرائیل: ۱۱۱)

”بادشاہی میں کوئی اس کا شریک (Partner) نہیں۔“

فَاُحْكَمْ بِلِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ ○ (المومن: ۱۲)

”لہذا حکم اللہ بزرگ و برتر کے لیے خاص ہے۔“

وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا ○ (الکہف: ۶۲)

”اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا۔“

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ○ (الاعراف: ۴۵)

”خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔“

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلّٰهِ ○ (آل عمران: ۱۵۳)

”لوگ پوچھتے ہیں: کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہہ دو کہ امر سارا اللہ کے لیے
مخصوص ہے۔“ (اسلامی ریاست)

قانون سازی

اسلام کے نظریہ سیاسی کا دوسرا جز قانون سازی سے متعلق ہے۔ مذکورہ سلسلہ مضامین میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

” (حاکمیت اللہ کے) اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے سلب کر لیا گیا ہے۔ کیوں کہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، بندہ اور محکوم ہے اور اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہو۔ البتہ قانون الہی کی حدود کے اندر استنباط و اجتہاد سے تفصیلات فقہی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے، جس کی اجازت ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو، ان میں روح شریعت اور مزاج اسلام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے۔ کیوں کہ ایسے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق ضوابط و احکام مقرر کرنے کا حق اہل ایمان کو دے دیا گیا ہے۔ لیکن جو بنیادی بات سامنے رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے، یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو (برحق) تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، وہ طاعت و باغی اور خارج از اطاعت حق ہے اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اس کے فیصلہ پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے:

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَذَا حَلَلٌ وَهَذَا حَرَامٌ
(النحل: ۱۱۶)

”اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو ان کے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال (Lawful) ہے اور یہ حرام (Unlawful) ہے۔“

اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ ط
(الاعراف: ۳)

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

”جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھہرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔“

وَمَنْ لَّمْ يَخُفْكُمْ مِمَّا أُنْزِلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ۝

(المائدہ: ۴۴)

”اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں جو اللہ نے اتارا ہے، تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔“

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَّخِذُوا كُمُؤَا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ

(النساء: ۶۰)

اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعویٰ تو کرتے ہیں اُن ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)۔“ (ایضاً)

برسرِ حق حکومت

تیسرا اہم سوال یہ ہے کہ کس حکومت کو برسرِ حق حکومت قرار دیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں:

”خداوندِ عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف وہ ہے جو اس قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اس نے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجا ہے۔ اسی کا نام خلافت ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۖ (النساء: ۶۴)

”اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لیے بھیجا ہے کہ حکم الہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔“

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بِهِنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ ۖ

(النساء: ۱۰۵)

”اے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے، تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔“

وَإِنْ أَحْكَمَ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ إِلَيْكَ ۖ

(المائدہ: ۴۹)

”اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اس ہدایت کے کسی جز سے نہ پھیر دیں، جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔“

أَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُونَ ۚ

(المائدہ: ۵۰)

”کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟“

يٰۤاَيُّهَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمَ بِهِنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ

(ص: ۲۶)

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ

اے داؤد! ہم نے تم کو خلیفہ مقرر کیا ہے۔ لہذا تم حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان

حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ اللہ کے راستے سے وہ تم کو بھٹکا لے

(ایضاً)

جائے گی۔“

مذکورہ بالا اسلامی تصورات کی روشنی میں ہم رائج الوقت جمہوریت اور سیکولرزم کا جائزہ

لے سکتے ہیں۔

جمہوریت

آج جمہوریت کی اصطلاح جس مفہوم میں استعمال ہوتی ہے، اس میں درج ذیل اجزاء شامل ہیں:

(الف) عوام کی حاکمیت کا تصور

(ب) عوامی نمائندگی کا تصور

(ج) عوامی حقوق اور شہری آزادیوں (Civil Liberties) کا تصور

(د) پارٹی سسٹم، امیدداری اور الیکشن کا طریقہ

اسلامی تصور حیات کی روشنی میں ہم ان چاروں اجزاء کا جائزہ لے کر دیکھ سکتے ہیں کہ وہ قابل قبول ہیں یا قابل رد۔

(الف) عوام کی حاکمیت

جہاں تک حاکمیت کا تعلق ہے، اسلام وضاحت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ ملک کا جائز حاکم صرف خداوندِ عالم ہے، کسی اور کو حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔ اللہ تعالیٰ نے جو قانون اپنے بندوں کو دیا ہے وہی واجب الاتباع ہے۔ بندوں کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ الہی قانون سے متصادم کوئی قانون سازی کریں، چنانچہ عوام کی حاکمیت کا تصور اسلام کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔ عوام حاکم نہیں ہیں، بلکہ سب کے سب اللہ کے بندے ہیں۔ اُن کے لیے مناسب یہ ہے کہ حاکمِ حقیقی کے آگے سرِ اطاعت جھکا دیں اور اس کے عطا کردہ قانون کی مخلصانہ پیروی کریں۔

البتہ اللہ تعالیٰ نے جو قانون انسانوں کو دیا ہے، بیش تر معاملات میں اس کی حیثیت اصولی ہدایت کی ہے۔ زندگی کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اس اصولی قانون کے تحت تفصیلی قانون سازی کی ضرورت بہ ہر حال پیش آتی ہے۔ اسلامی تصور کے مطابق اہل ایمان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ قانون کی ان تفصیلات کو مرتب کریں جن کے بارے میں الہی ہدایت خاموش ہے۔ اس کام کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اجتہاد کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے چند شرائط ہیں:

- (i) شریعت الہی پر ایمان اور اس کے اتباع کا مخلصانہ ارادہ
- (ii) عربی زبان و ادب سے اچھی واقفیت
- (iii) قرآن و سنت کا علم اور مصالح شریعت کی معرفت
- (iv) ماضی کے مسلمانوں کے اجتہاد سے واقفیت
- (v) ان معاملات و مسائل سے واقفیت جن کے ضمن میں اجتہاد مطلوب ہے
- (vi) اسلام کے مطابق سیرت و کردار

(ب) عوامی نمائندگی

اسلام اس بات سے اتفاق کرتا ہے کہ حکم راء وہ لوگ ہونے چاہئیں جن کو عوام نے اپنی آزاد مرضی سے اپنا حکم راء تسلیم کیا ہو۔ اسلامی اصطلاح میں 'آزادانہ بیعت' اسی امر کا نام ہے۔ اس کے برخلاف جبری بیعت کو اسلام درست نہیں سمجھتا۔ 'آزادانہ بیعت' کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے، اس کو اسلام نے تمدنی ارتقاء پر چھوڑ دیا ہے اور کسی تفصیلی طریق کار کا مسلمانوں کو پابند نہیں کیا ہے۔ اسلامی اسپرٹ کا تقاضا یہ بھی ہے کہ عوام کو حکم راءوں کے احتساب کا حق اور مواقع حاصل ہوں، تاکہ اس امر کا اطمینان کیا جاسکے کہ حکم راء فی الواقع اُن حدود کے اندر اپنے اختیارات کو استعمال کر رہے ہیں جو اسلام نے طے کر دی ہیں۔

یہ بات بھی واضح رہنی چاہیے کہ آج کل عوامی نمائندوں کے دو کام سمجھے جاتے ہیں: ایک یہ کہ وہ قانون سازی کریں، دوسرے یہ کہ وہ ملک کا انتظام کریں۔ چنانچہ مثلاً ہمارے ملک کے جمہوری نظام میں برسرِ اقتدار پارٹی کی تشکیل کروہ کابینہ ملک کا انتظام بھی کرتی ہے اور قانون سازی کے ضمن میں مجوزہ قوانین کے خاکے بھی تیار کرتی ہے (اگرچہ آخری منظوری کا اختیار پارلیمنٹ کو ہوتا ہے)۔ اس کے برعکس اسلامی مزاج یہ تقاضا کرتا ہے کہ انتظام ملکی اور قانون سازی کو الگ الگ رکھا جائے۔

اسلامی تصور کے مطابق ذیلی قانون سازی کی جاسکتی ہے۔ (جو شریعت الہی کے عطا کردہ اصولی قانون کے تحت ہو)، لیکن یہ کام محض اس بنا پر کسی شخص کے حوالے نہیں کیا جاسکتا کہ

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

اُسے عوامی اعتماد حاصل ہے، بلکہ ذیلی قانون سازی ان لوگوں کا کام ہے جو اجتہاد کے لیے درکار صفات اپنے اندر رکھتے ہوں۔ رہا انتظامِ ملکی تو وہ اُن حکم رانوں کے سپرد ہوگا جنہیں عوام کا اعتماد حاصل ہو۔

موجودہ جمہوریت کی زبان میں ’عوامی نمائندے‘ اُن کو سمجھا جاتا ہے جو عوام کی امنگوں یا خواہشات کے ترجمان ہوں۔ اسلام اس طرزِ فکر سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک حکم رانوں کا کام عوامی خواہشات کی پیروی نہیں ہے، بلکہ حق کی پیروی ہے۔ چنانچہ ’عوامی نمائندوں‘ کی اصطلاح اسلامی مزاج کی صحیح نمائندگی نہیں کرتی۔ دورِ جدید کی اسلامی ریاستیں اس اصطلاح کے بجائے عوام کے ’معمتد علیہ افراد‘ کی اصطلاح استعمال کر سکتی ہیں۔ حکم رانوں کو لازماً انہی معمتد علیہ افراد میں سے ہوں گے۔

(ج) بنیادی حقوق

اسلام یہ بات تسلیم کرتا ہے کہ افراد اور گروہوں کو بعض بنیادی حقوق اور شہری آزادیاں حاصل ہونی چاہئیں۔ اس بنیادی بات کی حد تک اسلامی تصور اور موجودہ جمہوریت باہم متفق ہیں۔ اس امر میں بھی اتفاق ہے کہ یہ حقوق اور آزادیاں مطلق نہیں ہیں، بلکہ بالاترِ اقدار اور مقاصد کے تحت مشروط ہیں۔

البتہ حقوق اور آزادیوں کی فہرست، ان کے مفہوم اور ان کے اطلاق کو محدود کرنے والی شرائط کے سلسلے میں اسلام اور موجودہ جمہوریت کے درمیان اتفاق نہیں ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس نے جو حقوق تسلیم کیے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔ جمہوری نظاموں میں ہر ملک کی کیفیت مختلف ہے۔

”حرمتِ جان یا جینے کا حق، عزت و آبرو کے تحفظ خصوصاً ناموسِ خواتین کے تحفظ کا

حق، بنیادی ضروریاتِ زندگی کی ضمانت، عدل و انصاف کے حصول کا حق، نیکی میں

تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق، مساوات کا حق، ظالم کی اطاعت سے انکار کا

حق، محصیت سے اجتناب کا حق، سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق، شخصی آزادی کا تحفظ، ملکیت کا تحفظ، نجی زندگی کا تحفظ، ظلم کے خلاف احتجاج کا حق، اخلاقی حدود کی پابندی، اظہارِ رائے کی آزادی، آزادیِ ضمیر، مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق، آزادیِ اجتماع کا حق، عملِ غیر کی ذمہ داری سے براءت، شبہات پر کارروائی نہ کیے جانے کا حق، عدالتی کارروائی کے بغیر سزا نہ دیے جانے کا حق، برائے اور مسلک کی آزادی کا حق۔“ (ایضاً)

غیر مسلم شہریوں کو بھی اسلامی ریاست میں یہ سب حقوق حاصل ہوں گے، البتہ سیاسی کارفرمائی میں ان کی شرکت کی ایسی صورتیں درست نہ ہوں گی جہاں وہ اسلامی ریاست کی بنیادی پالیسی کو تبدیل یا متاثر کر سکیں۔ رہے اُن کے اپنے تہذیبی امور تو اُن کو چلانے کے سارے اختیارات انھیں حاصل ہوں گے۔ مسلمان اُن میں مداخلت سے باز رہیں گے۔

(د) پارٹی سسٹم اور امیدواری

اسلامی مزاج سے یہ بات مطابقت نہیں رکھتی کہ کوئی شخص حکم رانی کے منصب کے لیے خود اپنے آپ کو پیش کرے اور امیدوار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ اس کے بجائے اسلامی اسپرٹ سے قریب تر طریقہ یہ ہوگا کہ علم، صلاحیت اور کردار کے لحاظ سے موزوں افراد کے نام کچھ معتبر ادارے پیش کریں اور پھر عوام کی مرضی معلوم کی جائے کہ وہ مجوزہ ناموں میں سے کن کو ترجیح دیتے ہیں۔ موجودہ جمہوریت اس پہلو سے بہت ناقص ہے اور اس کا امیدواری سسٹم بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسلام کے مطابق اس کی اصلاح ناگزیر ہے۔

اسی طرح سماج کو باہم متضام پارٹیوں میں تقسیم کرنا اسلام کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ اسلام اہل اسلام کو متحد دیکھنا چاہتا ہے۔ اگرچہ اسلامی ریاست پارٹی بنانے سے کسی کو بہ زور قانون نہیں روکے گی، لیکن معاشرے کی تربیت کے ذریعے وہ یہ چاہے گی کہ جائز مفادات کے حصول کے لیے لوگ پارٹی بنانے پر مجبور نہ ہوں، بلکہ ریاستی ادارے خود آگے بڑھ کر عوامی مسائل کے حل کرنے کا انتظام کریں۔

معتمد علیہ افراد کی نشان دہی کے لیے (جن کو حکم رانی کا کام سپرد کیا جاسکے) عوامی رائے دہی کے طریقے کو اسلام اصولاً درست سمجھتا ہے اور اس سے کام لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آئندہ تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں اس سے بہتر طریقے سامنے آجائیں تو ان کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔

جمہوری رجحان

موجودہ جمہوریت کے اجزاء ترکیبی کے تجزیے کے علاوہ یہ بات بھی سامنے رہنی چاہیے کہ انسانی تاریخ کے موجودہ مرحلے میں جمہوریت محض ایک نظام کا نہیں، بلکہ ایک رجحان کا نام بھی ہے۔ یہ رجحان آمریت، بادشاہت، جبر، مطلق العنانی اور لاقانونیت کے خلاف ہے اور آزادی، مساوات، قانون کی حکم رانی اور حریت فکر و خیال کی تائید کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اصولاً یہ رجحان ایک درست رجحان ہے اور انسانی فطرت کی خیر پسندی کا مظہر ہے۔ مغربی مزاج کی بے اعتدالی نے اس رجحان کو فساد زدہ کر دیا ہے۔ اعتدال و توازن کی بحالی کے لیے آزادی اور حریت کے اس رجحان کو ہدایت الہی اور آفاقی اخلاقی قدروں کا تابع بنانے کی ضرورت ہے۔ جمہوری جذبے کی اصولاً تائید کرتے ہوئے اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ ہدایت الہی کی روشنی میں جمہوری نظریے اور عمل کے اندر ضروری اصلاحات تجویز کریں۔

جمہوری رجحان کی تائید سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ تسلیم شدہ حقوق میں کسی کمی کو روانہ سمجھا جائے۔ اگر کسی ملک کے نظام قانون میں عوام کے بعض جائز حقوق تسلیم شدہ ہوں تو ہر ایسی کوشش کی مزاحمت کی جانی چاہیے جس کا منشا ان حقوق میں کمی لانا ہو۔ اسی طرح ہر ایسی تجویز کی تائید کی جانی چاہیے جس کے تحت عوام کو وہ حقوق مل سکیں جو ان کو اب تک نہیں ملے ہیں اور از روئے انصاف ملنے چاہئیں۔

علیٰ ہذا القیاس اگر کسی ملک میں الیکشن ہوتے ہوں اور رسمی جمہوریت قائم ہو تو وہاں ایسی تجاویز کی مزاحمت کی جانی چاہیے جن کا منشا آمریت یا ڈکٹیٹر شپ کا قیام ہو۔ اس کے برعکس اگر کسی ملک میں آمرانہ حکومت ہو تو ایسی تجاویز کی تائید کی جانی چاہیے جن سے جمہوری طرز کے

الیکشن وہاں شروع ہو سکیں۔ آزادی اجتماع، آزادی اظہار رائے اور پریس کی آزادی اگر موجود نہ ہوں تو ان آزادیوں کے حق میں بات کہنی چاہیے۔

سیکولرزم

جمہوریت کے علاوہ دوسرا مقبول نعرہ سیکولرزم ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال علم و فلسفے کے سیاق میں بھی ہوتا ہے۔ اجتماعی و سماجی زندگی کے سیاق میں بھی اور ریاست و حکومت کے سیاق میں بھی۔

(الف) سیکولر فلسفہ

علم و فلسفے کے سیاق میں سیکولرزم کے معنی یہ ہیں کہ کائنات اور مظاہر فطرت کے مطالعے سے جو نتائج اخذ کیے جائیں اور جو تصورات کائنات (World View) ترتیب دیا جائے وہ غیب کے انکار پر مبنی ہو۔ تمام معلومات کو اس طرز پر مرتب کیا جائے کہ کائنات کی تشریح خدا کے تصور کے بغیر کی جاسکے اور انسانی سماج کی تنظیم کے سلسلے میں جو کچھ سوچا جائے وہ ہدایت الہی سے بے نیاز ہو کر سوچا جائے۔

علم و فلسفے کا یہ تصور اسلام کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ اسلام اس حد تک موجودہ منہاج (Method) سے اتفاق کرتا ہے کہ معلومات کی فراہمی کا طریقہ دیانت دارانہ ہونا چاہیے (جس کو آج کل کی اصطلاح میں معروضی یا (Objective) کہا جاتا ہے)۔ لیکن اسلام غیب کے انکار اور ہدایت الہی سے بے نیازی کو صحیح نہیں سمجھتا۔

اسلام کے مطابق فلسفیانہ غور و فکر کا صحیح منہاج یہ ہے کہ دیانت داری کے ساتھ معلومات جمع کی جائیں، پھر ان کو مرتب کر کے دیکھا جائے کہ وہ ملحدانہ تصورات کائنات کی تائید کرتی ہیں یا خدا پرستانہ تصورات کائنات کی؟ اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے تو ہر غیر جانب دار طالب حق اس نتیجے پر پہنچے گا کہ تمام مظاہر فطرت اپنے اندر ایسی واضح نشانیاں رکھتے ہیں جو خدا پرستانہ تصور کی حقانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

دیانت دارانہ مشاہدے کے علاوہ اسلام قابلِ اعتماد خبر کو بھی ذریعہٴ علم سمجھتا ہے۔ عالمِ غیب کے بارے میں قابلِ اعتماد خبریں ہم کو انبیاء علیہم السلام کے ذریعے سے ملتی ہیں، جن کے صادق اور امین ہونے پر انسانیت کا اتفاق رہا ہے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک انبیاء کی دی ہوئی خبریں علم کا قیمتی حصہ ہیں، جن سے بے پروائی مہلک ہے۔

انسان کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کے لیے اسلام عقلِ انسانی کو کافی نہیں سمجھتا۔ اس کے نزدیک ہدایتِ الہی پر مبنی شریعت انفرادی و اجتماعی زندگی کی حقیقی رہ نما ہے۔ مزید برآں عقلِ انسانی تربیت کی محتاج ہے۔ اسلام کا تربیتی نظام انسان کے قلب و ذہن کی تربیت کرتا ہے اور اسے اس قابل بنادیتا ہے کہ صالح اجتماعی زندگی کی تعمیر میں عقلِ انسانی اپنا مثبت رول ادا کر سکے۔

(ب) سیکولر سوسائٹی

سیکولر سوسائٹی کے معنی یہ ہیں کہ انسانی تعلقات و معاملات کی تنظیم کے لیے درکار قدریں (values)، اصول (principles) اور قوانین (regulations) ہدایتِ الہی سے اخذ نہ کیے جائیں، بلکہ انسانی عقل و تجربے کو قدروں، اصولوں اور قانون کا منبع قرار دیا جائے۔ اسلام اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کی تین وجہیں ہیں:

- (۱) انسانی عقل و تجربہ محدود ہے اور ہدایت کے لیے ناکافی ہے۔
- (۲) انسانی عقلوں میں باہم اختلاف ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اکثریت کی رائے کا معقول ہونا کچھ ضروری نہیں۔

(۳) انسانی عقل، خواہشات سے متاثر ہو جاتی ہے اور عادلانہ فیصلے کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر اسلام کا نقطہٴ نظر یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قدریں، اصول اور قوانین، سب کا حقیقی سرچشمہ ہدایتِ الہی ہے۔ یہ ہدایت اللہ کے نبیوں کے ذریعے انسانوں کو ملتی ہے۔ اس ہدایت کی پیروی کر کے وہ سماج تعمیر کیا جاسکتا ہے جس میں انسان سکون، امن اور عدل سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ جس طرح فرد کے لیے صحیح نہیں ہے کہ خدا سے بغاوت کرے اسی طرح انسانی سوسائٹی کے لیے بھی یہ طرزِ عمل صحیح نہیں ہے کہ خدائی ہدایت کو نظر انداز کرے یا اس سے روگردانی کرے۔

سیکولر سوسائٹی کا نعرہ دنیا میں عرصے سے موجود ہے، لیکن دنیا کے کسی بھی خطے میں سوسائٹی سیکولر نہیں بن سکی ہے۔ ہر جگہ مذہب کے واضح اثرات سماج پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ یہ اثرات خاندانی نظام اور سماجی تقریبات کے دائرے میں زیادہ نمایاں ہیں، چنانچہ عملاً سیکولر سوسائٹی کا نعرہ ایک متحد المزاج سماج بنانے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے برعکس ایک ایسی سوسائٹی وجود میں آتی ہے جس میں تضاد اور دورگی موجود ہوتی ہے۔ زندگی کے بعض معاملات میں لوگ مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بعض معاملات میں غیر مذہبی نظریات اور فلسفوں کی طرف۔ یہ تجربہ بتاتا ہے کہ سیکولر سوسائٹی کا تصور ایک خیالی تصور ہے۔ عملاً دنیا میں کوئی سماج تشکیل پاتا ہے تو مذہب اس میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔

اسلام انسانی زندگی کو تضاد سے پاک دیکھنا چاہتا ہے چنانچہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ خدائی ہدایت کو سماجی تنظیم کی بنیاد بھی ہونا چاہیے اور انفرادی رویوں کی بھی۔ اس طرح پوری انسانی زندگی انتشار سے محفوظ ہو جاتی ہے۔

(ج) سیکولر ریاست

سیکولر حکومت یا ریاست کے معنی یہ ہیں کہ مذہبی امور کے اندر ریاست کی حدود میں رہنے والے تمام شہریوں کو آزادی ہو کہ اپنے اپنے مذہب کے مطابق عمل کریں اور دیگر تمام اجتماعی امور کے اندر ان قوانین اور طریقوں پر عمل کیا جائے جو حکومت نے طے کر دیے ہوں۔ اگر حکومت جمہوری ہو تو طے کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جن کو عوام کے نمائندے کہا جاتا ہے۔ اگر حکومت آمرانہ ہو تو قوانین و ضوابط طے کرنے والے وہ ہوں گے جو حکومت پر قابض ہوں۔

سوال یہ ہے کہ سیکولر حکومت یا ریاست کی معقولیت (Rationale) کیا ہے؟ یعنی سیکولر حکومت کیوں مطلوب ہے؟ اس سوال کے دو جواب دیے جاتے ہیں: ایک یہ کہ سیکولر فلسفہ حیات ایک معقول طریقہ فکر ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج یعنی سیکولر سوسائٹی اور سیکولر حکومت کو بھی قبول کرنا چاہیے۔ اسلام اس جواب کو رد کرتا ہے۔ سطور بالا میں یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ انسانی عقل و تجربہ محدود و ناکافی بھی ہے اور خواہشات انسانی سے متاثر بھی باسانی ہو جاتا ہے، چنانچہ

سیکولر فلسفے اور اُن کی بنیاد پر مرتب کیے گئے قوانین و ضوابط غلطیوں اور نقائص سے پُر ہیں۔ انسانی زندگی کو امن و سکون سے ہم کنار کرنے کے بجائے سیکولر طریقہ فکر نے دنیا میں صرف فساد برپا کیا ہے۔ سیکولر حکومت یا ریاست کی معقولیت کے سلسلے میں دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہر ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ اجتماعی و سیاسی زندگی بہ ہر حال اُن سب کو مل جل کر گزارنی ہے، اس لیے مذہب کو اجتماعی معاملات کا رہنما نہیں بنایا جاسکتا، اس لیے کہ مذاہب بہت سے ہیں، چنانچہ عقل انسانی کو اجتماعی زندگی کا رہنما قرار دینا چاہیے۔

اسلام اس جواب کو رد کرتا ہے۔ مذکورہ نقطہ نظر کو رد کرنے کی وجوہ یہ ہیں:

(i) اگر مذاہب متعدد ہیں تو سیکولر نظریات اور فلسفے بھی متعدد ہیں، چنانچہ سوسائٹی کے افتراق و انتشار کا مسئلہ سیکولر ریاست کے قیام سے حل نہیں ہوتا۔

(ii) عقل انسانی کی محدودیت اور کم زوریاں واضح ہیں، چنانچہ اس کی رہنمائی ناقابلِ اعتماد ہے۔

(iii) انسانی عقلوں میں باہم اختلاف ہے، اس لیے عملاً اکثریت کی رائے مانے بغیر چارہ نہیں اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اکثریت کی رائے غلطی کر سکتی ہے اور کرتی رہتی ہے۔

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ریاست یا حکومت کے بارے میں صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو امور مذہبی قرار دیئے جائیں اُن میں ہر گروہ آزاد ہو اور جن امور کو عام اجتماعی زندگی سے متعلق سمجھا جاتا ہے وہاں اُن آفاقی اقدار (values) کے مطابق عمل کیا جائے جو پوری نوعِ انسانی کی مشترک میراث ہیں۔ ان اقدار کو مستند ہدایت الہی نے قوانین کی شکل دی ہے۔ (جسے شریعت کہا جاتا ہے)۔ اہل ایمان کو قوی استدلال سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ تمام انسان فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اور یہ فطرت صالح ہوتی ہے۔ اجتماعی زندگی کے ضوابط وہ ہونے چاہئیں جو انسان کی فطرتِ صالحہ سے ہم آہنگ ہوں۔

اہل ایمان کی جانب سے اس استدلال کے پیش کرنے اور لوگوں کے اس کو قبول کرنے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس عبوری مدت کے دوران دنیا میں جو سیکولر ریاستیں موجود ہوں ان کے مسلمان شہریوں کو درج ذیل طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے:

- (i) ان کو یہ اصول مسلسل پیش کرتے رہنا چاہیے کہ انفرادی و اجتماعی زندگی کی فلاح ہدایت الہی کے اتباع میں ہے۔
- (ii) اُن کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ مذہب کا تصور وسیع ہو اور اُسی مناسبت سے دین پر عمل کی آزادی کا دائرہ وسیع تر ہوتا جائے، مثلاً صرف پرسنل لا کی آزادی کو کافی نہ سمجھا جائے، بلکہ تہذیبی گروہوں کو اپنے اصولوں کے مطابق نظام تعلیم چلانے کی آزادی حاصل ہو۔
- (iii) دین پر عمل کی آزادی کو سلب کرنے یا محدود کرنے کی جو کوششیں شریکوں کی طرف سے یا خود ریاست کی جانب سے ہوں، ان کی مزاحمت کی جانی چاہیے۔
- (iv) اہل ایمان کا یہ مستقل کام ہونا چاہیے کہ وہ معروف کی تلقین کریں اور منکر سے روکیں۔ اس تلقین اور نہی کے مخاطب افراد اور ادارے بھی ہیں اور خود ریاست بھی۔ چنانچہ اہل ایمان کو پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ریاستی قوانین کے دائرے میں بھی منکر مٹے اور معروف فروغ پائے۔
- (v) اہل ایمان کو یہ اصول پیش کرنا چاہیے کہ ریاست سیکولر فلسفوں کے بجائے شریعت الہی کو منہج قانون قرار دے۔

اسلام، سیکولرزم اور آفاقیت

انسانی دنیا میں نظریات کا تصادم ہوتا رہتا ہے۔ پرانے نظریات مٹتے ہیں اور نئے وجود میں آتے ہیں۔ نظریات کے ہجوم میں ایک شخص یہ سوال کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے کہ ان مختلف نظام ہائے فکر میں حق و صداقت کا حامل نظریہ کون سا ہے؟ اور وہ معیار کیا ہے جس پر کسی نظریے کی صداقت کو پرکھا جاسکتا ہو؟ ظاہر ہے کہ انسانی زندگی کے لیے یہ سوال بہت اہم ہے۔ جہاں تک سوال کے دوسرے جُز کا تعلق ہے، کسی نظریے کی صداقت کو جانچنے کے لیے عموماً تین معیارات تجویز کیے گئے ہیں:

(الف) زیر بحث نظریے اور مسلمہ حقائق میں مطابقت

(ب) نظریے کے اجزائے ترکیبی کے مابین ہم آہنگی — اور

(ج) آفاقیت۔

جہاں تک سوال کے پہلے جُز کا تعلق ہے، صداقت کے دعوے دار بہت سے نظریات دنیائے انسانیت میں موجود ہیں، جو انسانوں کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ان نظریات میں قابل ذکر دو ہیں: ایک سیکولرزم، جس کے پاس موجودہ دنیا کا سیاسی اور معاشی اقتدار ہے اور دوسرا اسلام۔ عالمی سطح پر خصوصاً مسلم ممالک کے اندر دونوں کے درمیان کش مکش جاری ہے اور تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ بنگلہ دیش کی موجودہ صورت حال اسی کش مکش کی غماز ہے۔ کسی نظریے کی صداقت کے مندرجہ بالا تین معیارات پر اسلام اور سیکولرزم کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اس وقت

صرف تیسرے معیار — آفاقیت — کے سیاق میں یہ موازنہ پیش نظر ہے۔ اس تقابل کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خود 'آفاقیت' کا مفہوم متعین کر لیا جائے۔

آفاقیت

کسی نظریے کو آفاقی نظریہ اُس وقت قرار دیا جاسکتا ہے جب اُس میں تین خصوصیات پائی جاتی ہوں:

(الف) اُس کی دعوت، بلا کسی تفریق کے، تمام انسانوں کے لیے ہو۔ انسانی آبادی کے کسی بچہ کو خطاب کرنے کے بجائے وہ ہر انسان کو اپنا مخاطب بناتا ہو اور اُس کی دعوت ہر فرد انسانی کے لیے یکساں پیغام رکھتی ہو۔ آفاقیت کے اس پہلو کا تعلق اس تنوع سے ہے جو انسانوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی نظریہ فی الواقع آفاقی نظریہ ہے تو اس کی دعوت میں اتنی قوت ہونی چاہیے کہ تمام تر تنوع کے باوجود ہر انسان اُسے سمجھ سکے اور قبول کر سکے۔

(ب) وہ کسی خاص زمانے کے لیے نہ ہو بلکہ بدلتے ہوئے حالات میں انسانی رہنمائی کی

صلاحیت اُس کے اندر پائی جاتی ہو۔ اس پہلو کو "زمانی آفاقیت" کہا جاسکتا ہے۔

(ج) انسان کی مکمل شخصیت، اُس کا موضوع ہو۔ وہ انسانی وجود کے کسی پہلو کو نظر انداز نہ

کرے، نفسِ انسانی میں پائے جانے والے تمام جذبات، داعیات اور تقاضوں کی

رعایت اُس میں موجود ہو اور وہ انسان سے ایسا کوئی مطالبہ نہ کرے جو اُس کی انسانی

فطرت سے ٹکراتا ہو۔

مذکورہ بالا خصوصیات میں سے پہلی خصوصیت کو چند مثالوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔

دورِ جدید کے متعدد نظریات ایسے ہیں جنہوں نے انسانوں کے کسی خاص گروہ کو خطاب کیا۔ مثلاً

کچھ نظریات اپنے عملی پروگرام کے ساتھ اس مقصد کے حامل بن کر سامنے آئے کہ کسی خاص نسل

کو بقیہ انسانی نسلوں پر اقتدار اور غلبہ حاصل ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اُن کا پیغام محض اُس نسل کے

افراد کے لیے تھا جس کا غلبہ وہ چاہتے تھے۔ بقیہ انسانوں کے لیے اُن کے پاس کوئی پیغام نہیں تھا۔

نازی ازم، فاشزم اور ہندو تو اس کی مثالیں ہیں۔ اس طرح کے نظریات کو آفاقی نہیں کہا جاسکتا۔ اسی طرح کمیونزم کا اصولی خطاب محض محنت کش طبقے (Working Class) سے ہے۔ (دوسرے طبقات سے کمیونسٹ ایجنڈے میں تعاون کی جواپیل کمیونزم کے داعیان کرتے ہیں وہ اُن کے فلسفے کے اندرونی تضاد کی علامت ہے۔) اپنی اساس کے لحاظ سے کمیونزم ایک غیر آفاقی نظریہ ہے۔ نیشنلزم (قوم پرستی) خصوصاً جارحانہ قوم پرستی (Aggressive Nationalism) بھی غیر آفاقی نظریہ ہے، اس لیے کہ ہر نیشنلزم کی اپیل اُن حدود کے اندر محدود ہوتی ہے جو اُس نیشن کی حدود ہوں۔ اُس سرحد کے باہر رہنے والے انسانوں کے لیے اس میں کوئی پیغام نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ہے کہ غیر آفاقی نظریات کا رول انسانی تاریخ میں انتہائی منفی رہا ہے۔ انسانوں کی باہم ایک دوسرے پر زیادتیوں کے لیے یہ نظریات جواز فراہم کرتے رہے ہیں اور اس طرح انھوں نے انسانی ضمیر کو سٹلانے کا کام انجام دیا ہے۔

اسلام کی دعوت

آفاقیت کا مفہوم سامنے آ جانے کے بعد زیر بحث دو نظریات اسلام اور سیکولرزم کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اس تقابل کے لیے ضروری ہے کہ ہر نظریے کے پیغام کو سمجھ لیا جائے۔ (الف) اسلام کا پیغام یہ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت و بندگی کی جائے اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے:

تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ
الْكِتَابَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللَّهَ مُخْلِصًا لَهُ الدِّينَ ۝ (الزمر: ۱-۲)

”اس کتاب کا نزول اللہ کی طرف سے ہے جو زبردست اور حکیم ہے۔ ہم نے تمھاری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے، پس اللہ کی بندگی کرو، دین کو اُس کے لیے خالص کر کے۔“

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً
وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا
تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرة: ۲۱-۲۲)

”اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی، جس نے تم کو اور تم سے پہلے نزرے ہوئے لوگوں کو پیدا کیا۔ تمہارے بچنے کی توقع اسی صورت میں ہو سکتی ہے۔ وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا، آسمان کی چھت بنائی، آسمان سے پانی اُتارا اور اُس کے ذریعے تمہارے رزق کے واسطے میوے نکالے۔ پس جانتے ہو جتنے دوسروں کو اللہ کا مد مقابل نہ ٹھہراؤ۔“

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۚ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي
الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنُبِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ
لَا يَحِبُّ مَنْ كَانَ فَخُورًا ۝ (النساء: ۳۶)

”اللہ کی بندگی کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو اور رشتے داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتے دار پڑوسی اور اجنبی ہمسائے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ پاس بیٹھنے والے ساتھی، مسافر اور اپنے مملوکوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ بے شک اللہ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اترانے والا اور بڑائی جتانے والا ہو۔“

(ب) اسلام کے پیغام کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت و رہنمائی کی مکمل اور مخلصانہ پیروی کی جائے اور اُس کو چھوڑ کر دوسروں کی رہنمائی کی پیروی نہ کی جائے:

الْبَصِّ ۚ كِتَابٌ أَنْزَلَ إِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِي صَدْرِكَ حَرَجٌ مِنْهُ
لِتُنْذِرَ بِهِ ۚ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ اتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ ۚ

رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ ○

(الاعراف: ۱-۳)

”ا۔ل۔م۔م۔ یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے تو تمہارے دل میں اس بارے میں کوئی جھگی نہ ہو (یہ کتاب اس لیے ہے کہ) تم اس کے ذریعے سے (انسانوں کو بُرے انجام سے) خبردار کرو اور ایمان لانے والوں کے لیے یہ نصیحت ہو۔ پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف تمہارے رب کی جانب سے نازل ہوئی ہے اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو، مگر تم نصیحت کم ہی قبول کرتے ہو۔“

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّبِعِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ إِنْ اللَّهُ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ إِنْ اللَّهُ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○

(الاحزاب: ۱-۲)

”اے نبی! اللہ سے ڈرو اور کافروں اور منافقوں کی بات نہ مانو۔ بے شک اللہ علیم و حکیم ہے۔ پیروی کرو اس وحی کی جو تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آئی ہے۔ جو کچھ تم کرتے ہو، بے شک اللہ اس کی خبر رکھتا ہے۔“

(ج) اسلام کی دعوت کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ انسانوں کے مابین فیصلہ اللہ کے احکام

کے مطابق کیا جائے:

وَإِنْ أَحْكَمُ بَيْنَهُمْ مِمَّا أُنْزِلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ أَنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ أَنْ يُصِيبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوبِهِمْ وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ لَفَاسِقُونَ ○

(المائدہ: ۴۹)

”اور لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس (قانون) کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے

اور اُن کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ اور ہوشیار رہو کہ وہ (منکرین حق) تمہیں بہکانے دیں کہ تم اللہ کے نازل کردہ کسی حکم کی پیروی سے باز رہ جاؤ۔ اور اگر یہ (حق کو) نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ کی مشیت یہی ہے کہ اُن کے بعض گناہوں کی سزا اُن تک پہنچا دے اور یہ واقعہ ہے کہ انسانوں میں سے بہت سے نافرمان ہیں۔“

(د) اسلام کی دعوت کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ جن امور کے بارے میں بھی انسانوں میں اختلاف واقع ہو اُن کے سلسلے میں ہدایت الہی کو حکم بنایا جائے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ○ (الشوریٰ: ۱۰)

”تمہارے درمیان جس معاملے میں بھی اختلاف ہو، اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہی اللہ میرا رب ہے، اُسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اُسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اِس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہ اللہ تعالیٰ کے مالک کائنات اور ولی حقیقی ہونے کا فطری اور منطقی تقاضا ہے۔ جب بادشاہی اور ولایت اُسی کی ہے تو لامحالہ پھر حاکم بھی وہی ہے اور انسانوں کے باہمی تنازعات و اختلافات کا فیصلہ کرنا بھی اُسی کا کام ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ عام ہیں اور وہ صاف صاف علی الاعلان، تمام نزاعات و اختلافات میں اللہ کو فیصلہ کرنے کا اصل حق دار قرار دے رہے ہیں..... جس طرح وہ اعتقادی اختلافات میں یہ طے کرنے والا ہے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا؟ ٹھیک اُسی طرح قانونی حیثیت سے بھی وہی یہ طے کرنے والا ہے کہ انسان کے لیے پاک کیا ہے اور ناپاک کیا، جائز اور حلال کیا ہے اور حرام و مکروہ کیا؟ اخلاق میں بدی و رشتی کیا ہے اور نیکی و خوبی کیا؟ معاملات میں کس کا کیا حق ہے اور کیا نہیں ہے؟ معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت میں کون سے طریقے درست ہیں اور کون سے غلط؟“ (تفہیم القرآن، سورہ شوریٰ، حاشیہ ۱۳)

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

(ہ) اسلامی نظریے کی ایک خصوصیت اُس کی ہمہ گیری اور جامعیت ہے۔ اسلام نے زندگی کے ہر پہلو میں انسان کی رہ نمائی کی ہے۔ قرآن مجید میں طہارت، وضو اور تیمم کا بھی ذکر ملتا ہے اور ذکر، شکر اور فکر کا بھی۔ جس طرح اسلام کی تعلیمات تزکیہ، عبادت اور حصول تقویٰ کے سلسلے میں انسان کی رہ نمائی کرتی ہیں اسی طرح وہ دعوتِ دین، حقوق العباد کی ادائیگی اور جہاد فی سبیل اللہ کی طرف بھی متوجہ کرتی ہیں۔ اسلام کی جامع رہ نمائی اخلاق، فاضلہ کی بلند یوں کی طرف انسان کو لے جاتی ہے اور بارِ امانت کا حق ادا کرنے کے لیے اس کو تیار کرتی ہے۔ اسلام نے اشخاص کی انفرادی اصلاح کو کافی نہیں سمجھا ہے، بلکہ معاشرے اور ریاست کی اصلاح کو کلیدی اہمیت دی ہے۔ اسی طرح اسلام کے نزدیک صرف باطن کی درستگی کا اہتمام کافی نہیں، بلکہ ظاہر کی طرف توجہ بھی ضروری ہے۔ انسانی زندگی کے تمام شعبے اسلام کے نزدیک اہم ہیں۔ خاندانی نظام، معاشرتی روابط، معاشی تنگ و دو، سیاست و حکومت، صلح و جنگ، تہذیب و تمدن، ثقافت و فنونِ لطیفہ اور تعلیم و تربیت، سب پر اسلام نے توجہ کی ہے۔ مظاہر کی کثرت کے باوجود اسلام کے نزدیک انسانی زندگی ایک وحدت ہے۔ وہ اس پوری زندگی کو اللہ کی بندگی کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے اور انسان کی شخصیت کے ہر پہلو کو غیر اللہ کی بندگی سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔

سیکولرزم کی دعوت

اسلام کی دعوت سامنے آ جانے کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ سیکولرزم کس بات کا علم بردار ہے اور وہ انسانوں کے سامنے کیا پیغام پیش کرتا ہے؟ آج کل بحث و گفتگو میں سیکولرزم کی اصطلاح بہت استعمال ہوتی ہے، لیکن پہلے اس کے لغوی معنی پر غور کیا جانا چاہیے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں سیکولرزم کا مفہوم یوں بیان کیا گیا ہے:

"Concerned with the affairs at this world, not spiritual or sacred, not concerned with religion or religious belief" (Edition 2006)

”سیکولرزم ایسا نظریہ ہے جو اس دنیا کے معاملات سے بحث کرتا ہے اور روحانیت یا تقدس سے عاری ہے۔ یہ مذہب یا مذہبی عقیدے سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔“

ویسٹسٹر ڈکشنری میں سیکولرزم کی اصطلاح کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

"A system of political or social philosophy that rejects all forms of religious faith and worship, the view that public education and the matters of civil policy should be conducted without the introduction of a religious element". (Edition 1996)

”سیکولرزم ایک منظم سیاسی و سماجی فلسفہ ہے جو مذہبی عقیدے اور عبادت کی ہر شکل کو مسترد کرتا ہے۔ سیکولرزم اس تخیل کا نام ہے کہ تعلیم اور دیگر اجتماعی امور کے نظم میں کسی مذہبی عنصر کی شمولیت نہ ہونی چاہیے۔“

اپنی تصنیف Secularization of European mind (یورپی ذہن پر سیکولرزم کا تسلط) میں چاڈوک (Chadwick) نے تذکرہ کیا ہے کہ پہلی بار سیکولرزم کی اصطلاح ہولیوک (Holoake) نامی مفکر نے ۱۸۵۱ء میں استعمال کی۔ وہ اور اس کے رفقاء اپنے آپ کو سیکولر کہتے تھے۔ انھوں نے Reasoner (معقولی) نامی جریدے کو اپنے خیالات کی تبلیغ کے لیے استعمال کیا۔ اس جریدے نے اپنے مشن کا تعارف یوں کرایا ہے:

"A journal concerning itself with this world—the issues which can be tested in this life"

”یہ ایک جیسا جریدہ ہے جو اس دنیا کے مسائل سے تعرض کرتا ہے اور ان سوالات پر بحث کرتا ہے جن کا تصفیہ اسی زندگی میں ممکن ہے۔“ (یورپی ذہن۔ باب چہارم)

چاڈوک اپنی مذکورہ بالا تصنیف میں تصریح کرتا ہے کہ سیکولرزم کی اصطلاح کو رواج دینے والا مفکر ہولیوک اپنے آپ کو ملحد کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ’ملحد‘ کی حیثیت سے تعارف کو ناپسند کرنے کی وجہ اس کے الفاظ میں یہ تھی:

"The public understands by that word one who is without God and also without morality, and who wishes to be without both".

”ملحد کی اصطلاح اس لیے نامناسب ہے کہ عوام ’ملحد‘ سے ایسا شخص مراد لیتے ہیں جو نہ

خدا سے کوئی واسطہ رکھتا ہو نہ اخلاقیات سے، بلکہ جو ان دونوں سے دور ہی رہتا
چاہتا ہو۔ (ایضاً)

مندرجہ بالا تشریحات کی روشنی میں سیکولرزم کے دو پہلو سامنے آتے ہیں:

(الف) ایک پہلو فلسفیانہ ہے۔ اس اعتبار سے سیکولرزم خدا اور انسان کے زندہ تعلق کی صاف کی نفی کرتا ہے۔ اگرچہ سیکولرزم کے ابتدائی داعی خود کو ملحد کہلانا پسند نہیں کرتے تھے، مگر اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ عوام میں اپنے خیالات پھیلانے کے خواہاں تھے، اس لیے عوام کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتے تھے۔ بہ ہر صورت یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ اُن کا رجحان الحاد کی جانب تھا۔ اس رجحان کی وجہ ان کا یہ اصرار تھا کہ صرف ان معلومات کو یقینی اور قابل اعتماد تسلیم کیا جانا چاہیے جو انسان کو اپنے مشاہدے اور تجربے سے حاصل ہوتی ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وحی الہی کو علم کا قابل اعتماد ذریعہ تسلیم نہ کرنا چاہیے۔ غیب کا انکار اس رجحان کا لازمی نتیجہ ہے۔

(ب) سیکولرزم کا دوسرا پہلو عملی ہے۔ اس اعتبار سے سیکولرزم اس رجحان کا نام ہے کہ اصلاً اس دنیا اور اس کے معاملات پر توجہ کی جائے۔ چاہے زبان سے آخرت کا انکار نہ ہو، لیکن زندگی کے امور و مسائل پر گفتگو اور بحث اور کارِ حیات کی انجام دہی میں آخرت اور اس کے امکان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اسی طرح سیکولرزم اس بات کا نام بھی ہے کہ تعلیم، سیاست اور دیگر اجتماعی امور کو مذہب سے آزاد رکھا جائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذہب یا الہی ہدایت کی طرف رجوع نہ کرنے کی صورت میں اجتماعی امور میں رہنمائی کس منبع سے حاصل کی جائے گی؟ اس سوال کا جواب سیکولرزم کے نزدیک یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کے معاملات کی تنظیم کے لیے انسانی عقل کو رہنما بنایا جائے گا۔ یہ عقل انسانی مشاہدات اور تجربات کو زیرِ غور لائے گی، اُن کو منظم کرے گی اور اُن سے نتائج اخذ کرے گی۔ چوں کہ مشاہدات اور تجربات قابل اعتماد ہیں اس لیے اُن سے اخذ کردہ نتائج بھی قابل اعتماد ہوں گے۔

دعوت کی عالم گیری

اسلام اور سیکولرزم کا مختصر تعارف سامنے آ جانے کے بعد اس اعتبار سے دونوں کا موازنہ کیا جاسکتا ہے کہ کیا ان نظریات نے تمام انسانوں کو اپنا مخاطب بنایا ہے اور کیا سب سے اُن کے خطاب کی نوعیت یکساں ہے؟ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، یہ بات بالکل واضح ہے کہ اُس کا خطاب تمام انسانوں سے ہے۔ قرآن مجید انسانوں کے لیے 'الناس' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اُس نے اپنی دعوت — بلا کسی تفریق کے — سارے انسانوں کو پیش کی ہے۔ ایرانی مفکر علی شریعتی اپنی تصنیف 'عمرانیات اسلامی' (Sociology of Islam) میں لکھتے ہیں:

”قرآن نے ہر جگہ 'الناس' کو خطاب کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو 'الناس' کی طرف بھیجا گیا، آپ نے 'الناس' سے خطاب کیا۔ مزید برآں اجتماعی عروج و زوال کا ذمہ دار بھی 'الناس' کو ٹھہرایا گیا ہے۔ عمرانیات کی زبان میں تشریح کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کو مجموعی حیثیت سے 'الناس' کہا گیا ہے۔ (مختلف طبقتوں اور گروہوں کے مابین فرق کو نظر انداز کرتے ہوئے)“

اسلامی خطاب کے عام ہونے کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہے کہ اسلام جو پیغام پیش کرتا ہے، وہ بھی سب کے لیے یکساں ہے۔ جو دعوت ایک فرد کے لیے ہے وہی دوسرے کے لیے بھی ہے۔ سب کو اسلام نے اللہ کی بندگی کی طرف ہی دعوت دی ہے۔ دعوت کی یہ یکسانیت انسانی مساوات کا لازمی نتیجہ ہے۔

خطاب کی عمومیت کے اعتبار سے اب سیکولرزم کے نظریے کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا سیکولرزم کا خطاب سارے انسانوں سے ہے؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ پچھلی دو صدیوں میں سیکولرزم کے علم برداروں نے پوری دنیا میں اس کی تبلیغ کی ہے اور جہاں موقع ملا ہے، جبر اور اکراہ کے ذریعے سیکولرزم کے نفاذ میں بھی کوئی دریغ نہیں کیا ہے۔ اس طرز عمل سے یہ بات بہر حال واضح ہو جاتی ہے کہ سیکولرزم اپنا پیغام سارے انسانوں تک پہنچانے کا قائل ہے۔

اس کی دعوت کسی ملک، طبقے یا گروہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ سب کے لیے ہے۔

اس موضوع سے متعلق دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا سیکولرزم کا پیغام ہر انسانی گروہ کے لیے یکساں ہے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے سیکولرزم کی دعوت کے ایک کلیدی جز پر غور ضروری ہے۔ وہ بنیادی نکتہ یہ ہے کہ انسانی مسائل میں رہ نمائی کے لیے 'ہدایت الہی' کے بجائے 'عقل' انسانی کی طرف رجوع کیا جائے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقل انسانی سے استفادہ کس طرح کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں پہلی مشکل تو یہ ہے کہ ہر فرد کی عقل الگ الگ رہ نمائی کرتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ باہم تبادلہ خیال اور بحث و مباحثے کے بعد بھی لوگوں کی رایوں میں یکسانی پیدا نہیں ہو پاتی۔ دوسری دقت یہ ہے کہ انسانی عقل آزادانہ اور دیانت دارانہ کام نہیں کرتی، بلکہ سوچنے والے فرد کے جذبات اور مفادات سے بہر حال متاثر ہوتی ہے۔ تیسری دشواری یہ پیش آتی ہے کہ عقل کو اپنا کام انجام دینے کے لیے زیر غور معاملے سے متعلق معلومات درکار ہوتی ہیں اور اکثر یہ معلومات ناقص اور ادھوری ہوتی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ خلاف واقعہ باتوں کو 'معلومات' کے طور پر پیش کر دیا جاتا ہے۔ جب عقل ناقص معلومات کی بنا پر نتائج اخذ کرتی ہے تو ظاہر ہے کہ نتائج بھی ناقص ہوتے ہیں۔ چوتھی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ پیچیدہ معاملات میں صحیح رائے پر پہنچنے کے لیے معاملے کے ہر پہلو پر غور کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سوچنے والے کی عقل معاملے کے ایک پہلو پر توجہ کرتی ہے تو دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ عقل کی رہ نمائی سے استفادہ کرنے میں حائل ان تمام دشواریوں سے ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے اجتماعی امور و مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہو۔

ان مشکلات کے علاوہ عقل انسانی سے استفادے میں سب سے بڑی دشواری جو سامنے آتی ہے وہ معیارات اور قدروں کے بارے میں ہے۔ انسانی رویوں کے تعین کے لیے رہ نما اقدار (Values) کی ضرورت پڑتی ہے جو خوب و ناخوب، صحیح و غلط، پسندیدہ و ناپسندیدہ اور مطلوب و نامطلوب طرز عمل کا فیصلہ کرتی ہیں۔ عقل اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، بلکہ اُس کو قدروں کے تعین کے لیے انسانی ضمیر اور وجدان کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے یا سماجی روایت (Tradition) سے رہ نمائی حاصل کرنی ہوتی ہے۔ جب ایک بار معیارات متعین ہو جاتے ہیں

تب انسانی عقل یہ کام کر سکتی ہے کہ ایسے طریقے سوچے اور ایسی تدابیر اختیار کرے جن سے مطلوبہ مقاصد حاصل ہو سکتے ہوں، یا اجتماعی معاملات میں ایسے ضوابط اور قوانین وضع کرے اور ایسی پالیسیاں مرتب کرے جو متعین اقدار کی آئینہ دار ہوں۔

مثال کے طور پر اگر کسی سماج میں حیا اور عفت و عصمت کو بنیادی قدر قرار دیا جائے اور فرد کی آزادی کو اخلاقی حدود کے تابع سمجھا جائے تو عقل انسانی اس مزاج سے مطابقت رکھنے والے ضوابط اور آداب وضع کر سکتی ہے، یا وہ موجود ہوں تو اُن کی معقولیت پر بہ آسانی مطمئن ہو سکتی ہے۔ مثلاً حیا اور پاکیزگی کی قدروں کی تابع عقل کے لیے یہ بات سمجھنا مشکل نہ ہوگا کہ بلا ضرورت اختلاط مرد و زن ناپسندیدہ ہے، مردوں اور عورتوں کو اپنی نگاہوں کی حفاظت کرنی چاہیے، عورتوں کے لیے یہ درست نہیں کہ غیر محرم مردوں کے سامنے اپنی زینت کا مظاہرہ کریں، پردے اور حجاب کا اہتمام ضروری ہے، نکاح کو آسان بنایا جانا چاہیے اور عورت کو سامان تجارت بنانا اُس کی توہین ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی سماج میں حیا اور پاکیزگی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی جائے، بلکہ جنسی معاملات میں فرد کی آزادی کو مطلق (Absolute) سمجھا جائے تو عقل انسانی اس مزاج سے مطابقت رکھنے والے قوانین و ضوابط وضع کر سکتی ہے۔ اس مزاج کی تابع عقل محض بدکاری کو جرم قرار نہ دے گی، بلکہ صرف اُس وقت اس فعل کو جرم سمجھے گی جب اس میں جبر شامل ہو (اس لیے کہ اُس صورت میں فرد کی آزادی مجروح ہوتی ہے)۔ اسی طرح پردے، حجاب اور اخفائے زینت کے احکام اس عقل کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت الہی کے بجائے عقل انسانی سے رہ نمائی حاصل کرنے کا سیکولر پیغام اپنے اندر ابہام (Ambiguity) رکھتا ہے۔ اس ابہام کو دور کرنے کے لیے یہ بتانا ضروری ہے کہ عقل اپنا فریضہ کن قدروں کی رہ نمائی میں انجام دے گی؟ سیکولرزم کے علم برداروں نے اپنے عملی رویے سے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ قدریں مغربی معاشرے سے لی جائیں گی۔ اس جواب پر پوری دنیا میں عمل بھی ہو رہا ہے۔ نظام تعلیم اور ذرائع ابلاغ پوری قوت سے مغربی قدروں کو دنیا میں پھیلارہے ہیں اور جو معاشرے اس تبلیغ میں

مزاحم ہیں، اُن پر بہ جبر اُن قدروں کو مسلط کیا جا رہا ہے۔ دنیا بھر کے سیاسی اور معاشی نظام اِس طرح مرتب کیے جا رہے ہیں کہ اُن قدروں کی حکمرانی کو یقینی بنایا جاسکے۔

اِس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مختلف انسانی گروہوں کے لیے سیکولرزم کا پیغام یکساں نہیں ہے۔ اہل مغرب کے لیے سیکولرزم کا پیغام یہ ہے کہ وہ انسانی امور و مسائل میں اپنی عقل کو رہنما بنائیں۔ رہی بقیہ انسانیت تو اِس کے لیے سیکولرزم کی دعوت یہ ہے کہ وہ مغربی عقل کا اتباع کریں، یعنی پہلے اُن قدروں کو تسلیم کریں جن کو صنعتی انقلاب کے بعد مغرب نے اپنا رہنما بنایا ہے۔ پھر اُن قدروں کے مطابق سماجی و سیاسی تنظیم کے لیے عقل کا استعمال کریں۔ مندرجہ بالا فرق کی بنا پر یہ بات واضح ہے کہ سیکولرزم آفاقی نظریہ نہیں ہے۔

زمانی آفاقیت

دعوت کی یکسانیت کے علاوہ آفاقی نظریے کی تعریف میں یہ وصف بھی شامل ہے کہ اُس کے اندر مختلف حالات میں انسانوں کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ آفاقی نظریہ کچھ دائمی اصول رکھتا ہے، جو کسی حال میں نہیں بدلتے، کچھ حدود متعین کرتا ہے جن سے انسانی سرگرمیوں کو محدود ہونا چاہیے اور کچھ مقاصد پیش کرتا ہے جن کے حصول کے لیے فرد، سماج اور ریاست کو کوشاں ہونا چاہیے۔ دائمی اصولوں، حدود، اقدار اور مقاصد کے تعین کے بعد آفاقی نظریہ انسانوں کو جزئیات اور تفصیلی تدابیر کے سلسلے میں آزادی دیتا ہے، جہاں وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق مناسب طرز عمل اختیار کر سکتے ہیں۔ گویا آفاقی قرار دیے جانے کے لیے نظریہ ایسا ہونا چاہیے جو دو قسم کے عناصر پر مشتمل ہو:

(الف) دائمی عناصر، جو وقت کے ساتھ نہیں بدلتے۔ اِن میں اصول، حدود، مقاصد، قدریں اور آداب شامل ہیں۔

(ب) غیر دائمی عناصر، جن میں وقت اور حالات کے ساتھ تبدیلی کی جاسکتی ہو۔ اِن میں جزئیات اور تفصیلی تدابیر شامل ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں قسم کے عناصر میں واضح خط امتیاز (Distinction) ضروری ہے۔ ہدایت الہی سے ماخوذ نظریے — اسلام — میں یہ امتیاز واضح ہے۔ جو کچھ کتاب الہی اور سنت رسولؐ سے ثابت ہے وہ دائمی ہے اور جن امور میں کتاب و سنت نے آزادی دی ہے وہ غیر دائمی عنصر سے متعلق ہیں۔ ان میں حالات بدلنے کے ساتھ، کتاب و سنت کی تربیت یافتہ عقل انسانی اپنا کام انجام دے سکتی ہے۔ اس سرگرمی کا نام اجتہاد ہے۔ مستقل اور غیر مستقل کے درمیان یہ واضح امتیاز الہی ہدایت کی بہت بڑی دین ہے، جو انسانوں کو غیر ضروری اختلافات سے بچا لیتی ہے۔ اس امتیاز سے عقل انسانی کا صحیح رول متعین ہو جاتا ہے۔ تبدیلی زندگی کا وصف ضرور ہے، لیکن حیات کے بعض پہلو دائمی بھی ہیں۔ آفاقی نظریہ اس حقیقت کا واضح ادراک رکھتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سیکولرزم زمانی آفاقیت کے معیار پر پورا اترتا ہے؟ کیا کوئی کتاب ایسی ہے جس پر سیکولر نظریے کے قائلین متفق ہوں اور جس کے مندرجات کو اس نظریے کا دائمی عنصر قرار دیا جاسکتا ہو؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اصولاً اس نظریے میں ہر چیز متغیر ہے، اس لیے کہ عقل انسانی کی پرواز پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ چنانچہ نظریے کے اجزائے ترکیبی میں سے کسی کو بھی دائمی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اصولاً اُن میں سے ہر جز میں تبدیلی کا یا اُس کے یکسر مسترد کر دیے جانے کا امکان موجود ہے۔

عملاً اس دشواری کا جو جواب سیکولرزم کے قائلین نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے مغرب کے تعامل کو سیکولر نظریے کا دائمی عنصر قرار دے لیا ہے۔ گویا اس وقت جو کچھ مغرب میں مسلم ہے وہ اُن کے نزدیک ہر قسم کے حالات کے لیے صحیح اور درست ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مفروضہ ہے، جس کے حق میں کوئی معقول دلیل نہیں دی جاسکتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ جبر کے ذریعے دنیا کو مجبور کیا جائے کہ مغرب کے مفروضات کو تسلیم کر لے، خواہ وہ اُس کی سمجھ میں نہ آتے ہوں۔ اس وقت سیکولرزم کے داعیوں کا طرز عمل بتاتا ہے کہ وہ بہ جبر دنیا پر اپنی فکر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔

اس بحث سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ زمانی آفاقیت کے اعتبار سے بھی سیکولرزم آفاقی نظریہ نہیں ہے۔

نظریے کی جامعیت

کسی نظریے کے آفاقی قرار دیے جانے کے لیے تیسری ضروری شرط یہ ہے کہ وہ نظریہ حیاتِ انسانی کے ہر پہلو میں رہ نمائی کا فریضہ انجام دے۔ ظاہر ہے کہ اسلام اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ اسلام کی اس خصوصیت کا تعارف کراتے ہوئے مولانا سید جلال الدین عمری لکھتے ہیں:

” (اسلام) فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ یہ عقیدہ بھی ہے اور عبادت بھی۔ یہ اخلاق بھی ہے اور قانون بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق بھی جوڑتا ہے اور انسانوں کے ایک دوسرے سے روابط بھی درست کرتا ہے۔ یہ فرد کی اصلاح بھی ہے اور سماج کی تعمیر بھی۔ یہ تزکیہ و طہارت بھی ہے اور جدوجہد اور جہاد بھی۔ اس میں روح کی تسکین بھی ہے اور مادی ضروریات کی تکمیل بھی۔ یہ انسانوں کے جذبات و احساسات اور خیالات کی بھی نگرانی کرتا ہے اور اس کے معاملات کو بھی دیکھتا ہے۔ یہ اس کی روح کو خدا کے سامنے جھکاتا اور اس کے جسم کو اس کے احکام کا پابند بناتا ہے۔ یہ دینِ عورت کے لیے بھی ہے اور مرد کے لیے بھی۔ جوان کے لیے بھی ہے اور بوڑھے کے لیے بھی، حاکم کے لیے بھی ہے اور محکوم کے لیے بھی۔ امیر کے لیے بھی ہے اور غریب کے لیے بھی۔ یہ ہر ایک کے حقوق بھی بتاتا ہے اور فرائض بھی۔ یہ فرد اور معاشرہ دونوں پر خدا کی حکومت قائم کرتا ہے۔ اس کی حکومت ظاہر پر بھی ہوتی ہے اور باطن پر بھی۔ یہ فرد کو پاکیزہ زندگی اور قوموں کو عروج و ترقی عطا کرتا ہے۔ یہ خدائے قدوس کا دین ہے۔ اس میں دنیا کی کام یابی بھی ہے اور آخرت کی کام یابی بھی۔“ (اسلام اور اس کی دعوت)

اب اس کسوٹی پر سیکولرزم کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ سیکولر نظریہ آخرت کا کوئی تصور نہیں رکھتا، چنانچہ وہ صرف دنیا کے معاملات سے بحث کر سکتا ہے۔ ان معاملات میں اپنے عین مزاج کے مطابق سیکولرزم صرف اجتماعی معاملات سے تعرض کرتا ہے اور اجتماعی امور کے بھی صرف اُس ظاہری پہلو پر توجہ کرتا ہے جو مشاہدے کی گرفت میں آ سکتا ہو۔ ان ساری محدودیتوں کے علاوہ یہ بات بھی واضح ہے کہ سیکولر نظریے کے پاس افراد کی اصلاح و تربیت کا

کوئی پروگرام نہیں ہے۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانی زندگی کے بہت سارے پہلو ایسے ہیں جن میں سیکولرزم نے کوئی رہنمائی فراہم نہیں کی ہے۔

اس کے برعکس یہ واقعہ ہے کہ مذہب انسان کی نفسیاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور اگر مذہب کو انسانی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو ایسا خلا پیدا ہوتا ہے جس کو سیکولر نظریہ پر نہیں کر سکتا مثلاً:

(الف) اطمینانِ قلب انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ مذہب بتاتا ہے کہ اللہ کی یاد سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

(ب) انسان موت کے بعد کی زندگی میں نجات کا خواہاں ہے۔ مذہب اُسے بشارت دیتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کے نتیجے میں اُسے نجات حاصل ہوگی۔ (کہا جاسکتا ہے کہ بہت سے لوگ زندگی بعد موت کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے لیے نجات کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں موت کے بعد آنے والی زندگی کا خیال موجود ہوتا ہے اور وہ کسی طرح اس اندیشے سے آزاد نہیں ہو سکتا کہ وہاں اُسے کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا۔)

(ج) انسان زندگی کی مشکلات میں ایسا ولی و مددگار چاہتا ہے جس کی پناہ میں آ کر وہ مصائب و آلام کا مقابلہ کر سکے۔ مذہب بتاتا ہے کہ خالق کائنات کا سہارا حقیقی سہارا ہے۔ اُس سے دعا مانگ کر اور اُس کی پناہ طلب کر کے انسان مسائلِ حیات سے نبرد آزما ہونے کی طاقت فراہم کر سکتا ہے۔

(د) انسان کے قلب میں خیر کی طرف فطری رجحان اور شر سے بیزاری دونوں موجود ہیں، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ بہک جاتا ہے اور اپنی خواہشات کا اتباع کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ خیر کے راستے سے اُس کے قدم ہٹ جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں انسان کسی قوی محرک کا طالب ہوتا ہے، جو اُس کے اندر نفس کی چالوں کے مقابلے کی قوت پیدا کر سکے۔ مذہب کا عطا کردہ تصورِ آخرت انسان کی اس ضرورت کو پوری کرتا ہے۔

مذکورہ بالا نکات کی بنا پر صاف اور سیدھا سوال یہ ہے کہ کیا انسان کو ایسا نظریہ درکار ہے جو زندگی کے تمام شعبوں میں رہ نمائی کرے، یا ایسا نظریہ جو محض بعض شعبوں سے بحث کرتا ہو؟ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت جامع نظریے کا تقاضا کرتی ہے اور جزوی رہ نمائی سے اُس کی تشنگی پوری نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جامعیت کے اعتبار سے بھی سیکولرزم کو آفاقی نظریہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ جو لوگ فی الواقع حق کے متلاشی ہیں اُن کو آفاقیت کی کسوٹی پر نظریات کو پرکھنا چاہئے۔ اُن پر یہ حقیقت کھل جائے گی کہ فی الواقع آفاقی نظریہ حیات صرف اسلام ہے۔ اسی نظریے کو اپنا کر انسانیت کامیابی سے ہم کنار ہو سکتی ہے۔

سیکولرزم: تاریخی اور نفسیاتی تجزیہ

تیونس کے رہ نما جناب راشد الغنوشی نے ۲ مارچ ۲۰۱۳ء کو 'سیکولرزم' کے عنوان پر ایک اہم خطاب کیا۔ اس خطاب کا اہتمام تیونس کے ادارے 'مرکز برائے مطالعہ اسلام و جمہوریت' (Centre for Study of Islam and Democracy) نے کیا تھا۔ موصوف کے خطاب کے بنیادی نکات یہ تھے:

(۱) سیکولرزم کسی ایک تصور کا نام نہیں ہے، بلکہ متعدد روپ رکھتا ہے۔ اس طرح اسلام کی تعبیریں بھی بہت سی ہیں۔

(۲) بہ ظاہر سیکولرزم ایک فلسفہ معلوم ہوتا ہے، لیکن تاریخی حقیقت یہ ہے کہ یورپ میں سیکولرزم بعض عملی مسائل کے حل کے لیے وجود میں آیا، جو وہاں کے سماج کو درپیش تھے۔ مسائل اس لیے پیدا ہوئے تھے کہ یورپ کے روایتی مذہب کے کلمہ جامعہ ہونے کی حیثیت ختم ہو چکی تھی اور ایک متبادل کلمہ جامعہ کی تلاش تھی۔

(۳) سیکولرزم کا سب سے اہم عنصر اس امر پر اصرار ہے کہ ریاست کو مذہب کے سلسلے میں غیر جانب دار ہونا چاہیے۔ یعنی ایک فرد کیا عقیدہ رکھے؟ اس معاملے میں ریاست مداخلت نہ کرے۔

(۴) مندرجہ بالا تصور سے قریبی تعلق رکھنے والا دوسرا تصور یہ ہے کہ ریاست افراد کو ان کی

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

مذہبی آراء کے سلسلے میں بھی آزادی دے اور سیاسی آراء کے سلسلے میں بھی۔ وہ کسی پارٹی کی طرف دار نہ ہو۔

(۵) میثاقِ مدینہ میں مذہبی اعتبار سے مسلمانوں اور یہودیوں کو ایک دوسرے سے ممتاز گردہ سمجھا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود سیاسی اعتبار سے وہ ایک نیشن سمجھے گئے تھے۔ مذہب و سیاست کے درمیان یہ امتیاز قابلِ غور ہے۔

(۶) اسی طرح فقہاء نے 'عبادات' اور 'معاملات' میں امتیاز کیا ہے۔ اُن کے نزدیک معاملات میں اصل اہمیت مصالح و مقاصد کی ہے۔

(۷) عموماً مسلمانوں نے دینی امور میں مسلمان حکمرانوں کی مداخلت کو پسند نہیں کیا ہے۔ جب کسی حکم راء نے کسی خاص فقہ کے نفاذ کی کوشش کی تو یہ کوشش کام یاب نہ ہو سکی۔

(۸) اسلام میں کوئی چرچ نہیں ہے، چنانچہ قانون سازی کا آخری اختیار اُن نمائندوں کو ہونا چاہیے جنہیں عوام نے منتخب کیا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہوگا کہ یہ نمائندے اسلامی تعلیمات اور اقدار سے بہ خوبی واقف ہوں۔

مندرجہ بالا خطاب پر کوئی تبصرہ پیش کرنے کے بجائے اس تحریر میں اُن تاریخی اور نفسیاتی عوامل کا جائزہ لینا پیش نظر ہے جو سیکولرزم کی ابتداء اور فروغ کا باعث بنے۔ اس تجربے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اگر سیکولرزم کو جدید ریاست کا مطلوبہ وصف قرار دیا جائے (جیسا کہ موجودہ دنیا کا عام رجحان ہے) تو اس کی تعریف متعین کرنے میں اس کے مخصوص تاریخی و نفسیاتی پس منظر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بہ الفاظِ دیگر سیکولرزم کی کسی ایسی تعریف کو، جو اس پس منظر کے مغائر ہو، یا تو فریب خوردگی کہا جائے گا یا سادہ لوحی۔ سیکولر حلقوں کو مطمئن کرنے کے لیے اگر کوئی مسلمان ملک اپنے نظام کو سیکولر کہے تو اندیشہ ہے کہ رفتہ رفتہ اُسے سیکولرزم کی اُن تمام خصوصیات کو بھی قبول کرنا پڑے جو سیکولرزم کے تاریخی سفر کا ناقابلِ انکار جزو بن چکی ہیں۔ اس سفر کا جائزہ درج ذیل ہے:

مذہب اور فطرتِ انسانی

بعض سوالات ایسے ہیں، جن کو ہر انسان زندگی کے کسی نہ کسی مرحلے میں ضرور دریافت کرتا ہے۔ ممکن ہے یہ کام خاموشی کے ساتھ دل ہی دل میں ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ ان سوالات کو الفاظ کا جامہ پہنائے اور دوسروں کے سامنے بھی ان سوالات کو رکھے:

- (الف) کیا میں محض 'جسم' ہوں یا 'روح' اور 'جسم' دونوں ہوں؟
- (ب) اگر روح کا وجود ہے تو میرے پیدا ہونے سے قبل وہ روح کہاں تھی؟ یا وہ میرے ساتھ (یعنی جسمانی وجود کے ساتھ ہی) وجود میں آئی؟
- (ج) مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ کیا روح کو بھی موت آجائے گی یا اس کا کوئی اور انجام ہوگا؟
- (د) اس کائنات کا مالک اور فرماں روا ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو میرا اس سے کیا تعلق ہے؟
- (ه) کائنات اور موجودات کے ساتھ میرا صحیح تعلق کیا ہے؟ (بہ الفاظِ دیگر، انسانوں کا اور دوسری موجودات کا باہمی تعلق کس نوعیت کا ہے؟)

ان سوالات کو مذہبی نوعیت کے سوالات کہا جاسکتا ہے۔ انسانوں کی بڑی اکثریت ہر زمانے میں ان سوالات کا جواب مثبت انداز میں دیتی آرہی ہے۔ مثلاً انسانوں کی بڑی تعداد روح کے وجود کی قائل ہے اور روح کو جسم سے پہلے موجود سمجھتی ہے۔ اسی طرح عام طور پر انسان خدا کی ہستی کے قائل ہیں، جو کائنات کا خالق، مالک اور فرماں روا ہے۔ اسی طرح انسانوں کا عام خیال یہ ہے کہ جسمانی موت کے ساتھ روح کی موت واقع نہیں ہوتی اور وہ اپنے سابق اعمال کے مطابق اچھے یا برے انجام سے دوچار ہوتی ہے۔

انسانوں کی بڑی اکثریت کے مندرجہ بالا خیالات کو مذہبی خیالات کہا جاسکتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ انسان عام طور پر مذہبی خیالات کے حامل ہوتے ہیں اور ان خیالات کا کچھ نہ کچھ اثر کم یا زیادہ ان کی عملی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ اس واقعے کے بالکل برعکس ایک دوسری حقیقت بھی ہے، جس کا تعلق پچھلے چار سو سال کی تاریخ سے ہے۔ اس تاریخ کے تذکرے سے قبل

مندرجہ بالا حقیقت سے جو اہم نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے، اس کا تذکرہ ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ 'انسان کی فطرت مذہبی واقع ہوئی ہے۔'

یورپ کی نشاۃ ثانیہ

البتہ انسان کی فطرت کے مذہبی ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ مذہب کے تحت جو تفصیلی تصورات بھی انسانوں کے سامنے پیش کر دیے جائیں، لوگ بہ ہر حال ان کو اطمینانِ قلب کے ساتھ قبول ہی کر لیں۔ چنانچہ یورپ کی تاریخ میں ایسا ہی ایک اہم واقعہ پیش آیا۔ جدید دنیا کی تاریخ پر یورپ کے اس واقعے کا جو اثر پڑا، وہ غیر معمولی ہے۔ جدید دنیا کو سمجھنے کے لیے اس واقعے کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

ہوایہ کہ 'مذہب' کے عنوان کے تحت یورپ میں انسانوں کو جو کچھ ملا وہ عیسائیت کے تصورات تھے۔ یہ تصورات ان تعلیمات کے آئینہ دار نہ تھے جن کو عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا، بلکہ آپؐ کی تعلیمات میں تحریف کر کے ایک نیا دین بنا لیا گیا تھا (اور اسے 'عیسائیت' کہا جانے لگا تھا)۔ مذہب عیسائیت کے تصورات درج ذیل تھے:

(الف) تثلیث کا تصور

توحید کے ساتھ تثلیث کا تصور، یعنی خدا کو ایک بھی سمجھا جاتا تھا اور اس ایک خدا کے ساتھ عیسیٰ علیہ السلام اور روح القدس (حضرت جبرئیل) کو خدائی میں شریک بھی ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس عجیب و غریب ملفوے کی کوئی توجیہ نہیں کی جاسکتی تھی، بلکہ الفاظ میں اسے قابلِ فہم انداز میں بیان کرنا بھی مشکل تھا۔

(ب) اربابِ مذہب کا گروہ

مذہبی افراد ('یاربابِ مذہب') کے ایک گروہ کی موجودگی (جن کے لیے انگریزی اصطلاح Clergy استعمال ہوتی ہے)۔ اس طبقے میں پادری، احبار اور رہبان شامل تھے۔ ان

کی پوزیشن عام انسانوں سے بالاتر تھی۔ کلامِ الہی کو سمجھنا اور اس کی تشریح کرنا ان کا کام تھا اور عام انسانوں کو اس کا حق نہ تھا کہ ان کی بیان کردہ تشریح کے علی الرغم کلامِ الہی کی تفہیم میں اپنی عقل کو بھی استعمال کر سکیں۔ اپنی اغراض کے لیے اور لوگوں کا مال حاصل کرنے کے لیے یہ اربابِ مذہب، کلامِ الہی کی من مانی تشریح کرتے تھے اور اس میں لفظی و معنوی تحریف کر کے اپنے مفادات کی خدمت کرتے تھے۔

ان اربابِ مذہب کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ مذہبی رسومات تنہا وہی انجام دے سکتے تھے۔ عام انسانوں کو اس کا حق نہ تھا، مثلاً شادی کی رسم ان کے بغیر انجام نہ پاسکتی تھی۔ مزید برآں لوگ ان کے سامنے اپنے گناہوں کا اقرار کر کے اپنی نجات کے خواہاں ہوتے تھے۔ عام انسانوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ بہ راہِ راست اپنے خدا سے رجوع کر سکیں اور اپنی خطائیں معاف کرائیں۔

رفتہ رفتہ اس طبقے نے تقدس کا ایک ہالہ اپنے گرد قائم کر لیا۔ ان کے لیے Holiness کی صفت بہ طور لقب استعمال ہونے لگی اور اکثر اوقات اپنے اخلاق و کردار کی پستی کے باوجود ان کے تقدس پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔

(ج) رہبانیت

مذہبِ عیسائیت کا تیسرا تصور رہبانیت تھا۔ روحانی انتہا پسندی اور غلو کے نتیجے میں یہ خیال پیدا ہوا جو مقبول بھی ہو گیا کہ مثالی اور معیاری مذہبی زندگی کے لیے رہبانیت یعنی ترک دنیا ضروری ہے۔ اس خیال کے نتیجے میں ایک طبقے نے، جو روحانی بلندی کا خواہش مند تھا، رہبانیت اختیار کر لی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس طبقے کے بعض افراد کے اندر اعلیٰ روحانی صفات پیدا بھی ہوئیں، لیکن دوسری طرف اس کا یہ نتیجہ بھی نکلا کہ عام لوگوں میں مذہب کے ناقابلِ عمل ہونے کا خیال پیدا ہو گیا۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ مذہب ایسے مطالبات کرتا ہے جن کو پورا کرنا ہم عام انسانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ جہاں تک ہم عام انسانوں کا تعلق ہے، ہم کو بس

عصر حاضر کے پرفریب نعرے

اس پر قناعت کرنی چاہیے کہ چند مذہبی رسومات انجام دے دیا کریں اور 'ارباب مذہب' کی حتی المقدور خدمت کرتے رہیں۔

(د) غیر عملی اخلاقی اقدار

مذہب کے ناقابل عمل ہونے کے اس خیال کو مزید تقویت ایک چوتھے عنصر سے ملی۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بعض اقوال کو سیاق سے الگ کر کے (اور ان میں تحریف کر کے) ایسے معانی بیان کیے گئے جن میں اخلاقی قدروں کا ایک غیر عملی تصور پیش کیا گیا۔ مثلاً ایک مشہور قول بیان کیا جاتا ہے کہ "جو تمہارے ایک گال پر طمانچہ مارے اسے دوسرا گال بھی پیش کر دو۔" اگر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اس ہدایت کا انتساب صحیح بھی ہو تو یہ بات کسی خاص سیاق میں کہی گئی ہوگی۔ اس کو عموم پر قیاس کر کے 'لامحدود عفو و درگزر' کی ایک ایسی اخلاقی قدر پیش کی گئی جو ناقابل عمل تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تو نہیں نکلا کہ عیسائی سماج فی الواقع اس 'غیر مشروط اور لامحدود عفو و درگزر' کے رویے پر عمل کرنے لگا ہو۔ اس کے برعکس نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ عملی زندگی کے لیے اخلاقی حسن و قبح کے سوال کو ہی سرے سے غیر متعلق (Irrelevant) سمجھنے لگے اور عملی زندگی کی بنیاد انہوں نے مفاد پرستی پر رکھی۔

(ه) شریعت کی منسوخی

اس رجحان کو مزید تقویت ایک دوسری بڑی تحریف سے ملی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ظاہری مذہبیت کی نفی کی تھی اور مذہب کی حقیقی روح کے احیاء پر زور دیا تھا۔ اس 'نفی' کو تحریف کرنے والوں نے شریعت کی نفی کے معنوں میں لیا اور سینٹ پال کے بعد عام عیسائی دنیا میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔

عام عیسائی نے جب یہ بات سنی کہ شریعت منسوخ ہو گئی ہے کہ تو اُس نے اپنے آپ کو شریعت کی پابندی سے آزاد کر لیا۔ اس طرح اخلاقی اقدار کے ساتھ احکام شریعت کا تعلق بھی عملی زندگی سے کٹ گیا۔ گویا اب مذہب ناقابل عمل ہونے کے ساتھ ساتھ 'غیر واجب العمل' بھی

قرار پایا۔ ذہنوں سے یہ خلش بھی مٹ گئی کہ شریعت کی خلاف ورزی کر کے وہ کسی گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

(و) کفارہ

اس رجحان کو اپنی آخری حد تک پہنچانے کا کام کفارے کے تصور نے کیا۔ یہ خیال پیش کیا گیا کہ جو لوگ ایک خدا کے ساتھ اس کے ”بیٹے“ پر ایمان کا باطل عقیدہ بھی اختیار کر لیں، ان کے گناہ اپنے آپ بخش دیے جائیں گے اس لیے کہ (اس باطل خیال کے مطابق) حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کی سب ایمان لانے والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ کفارے کے عقیدے کے بعد اس امر کی کوئی خاص ضرورت باقی نہ رہی کہ لوگ گناہوں سے بچنے کی کوشش کریں، اس لیے کہ کفارے کے ذریعے گناہوں کی بخشش تو ہو ہی جائے گی۔

ردِ عمل

عیسائیت کے ان تصورات کا جو شخص بھی جائزہ لے گا، اس کا تاثر یہ ہوگا کہ یہ تصورات عقل کے خلاف ہیں، نیز مذہب اور اخلاق کا رشتہ انسانی زندگی سے بہت کم زور کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ رشتہ عملاً کٹ جاتا ہے۔ یہ تو وہ تاثر ہے جو ان تصورات کے سرسری جائزے سے سامنے آ جاتا ہے، لیکن جن لوگوں نے ان تصورات کو عمل کے جامے میں دیکھا، ان پر مزید یہ حقیقت بھی کھلی کہ ان تصورات کے نتیجے میں انسان دو طبقات میں تقسیم ہو جاتے ہیں: ایک عام انسانوں کا طبقہ اور دوسرا ’ارباب مذہب‘ کا طبقہ۔ اس دوسرے طبقے کو پہلے طبقے پر نمایاں برتری حاصل ہوتی ہے۔ اس کا اقتدار لوگوں کے ذہنوں اور قلوب پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں عام انسانوں کا مال بھی اس کے ہاتھ آتا ہے اور سیاسی اقتدار بھی یا تو براہ راست اس طبقے کو مل جاتا ہے یا حکمِ راں اس کی تائید کے محتاج اور اس کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔

چنانچہ ان تصورات کا ردِ عمل ہوا اور چار صدی قبل یورپ کے اہل دانش نے ’مذہب عیسائیت‘ سے بغاوت کر دی۔ وہ ایسے مذہب کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جو عقل سے ٹکراتا ہو اور

انسانوں کو اپنے جیسے انسانوں کا غلام بنادیتا ہو۔ اس بغاوت کا نتیجہ کش مکش کی شکل میں نکلا۔ جس میں ایک طرف 'ارباب مذہب' تھے اور دوسری طرف 'اہل عقل و دانش'۔ ان دونوں رجحانات کا مقابلہ علمی دنیا میں بھی ہوا اور سیاسی دنیا میں بھی۔ بالآخر ارباب مذہب نے شکست کھائی اور یورپ میں یہ بات عام طور پر تسلیم کر لی گئی کہ انسانی رویے کی بنیاد عقل پر ہونی چاہیے نہ کہ مذہب پر۔ یہ کش مکش شدید بھی تھی اور جاں گسل بھی، اس لیے رفتہ رفتہ دونوں جانب انتہا پسندانہ رویے اختیار کیے گئے۔

سیکولرزم کی ابتدا

'اہل دانش' نے آغاز میں عیسائیت سے بغاوت سے کی تھی، لیکن بالآخر انھوں نے خود 'نفس مذہب' کو غیر معقول ٹھہرایا اور اسے رد کر دیا۔ پھر یہ رجحان آگے بڑھا اور ہر ایسے تصور، رویے یا قدر کو 'خلاف عقل' اور 'قابل رد' ٹھہرایا گیا جس کا تعلق غیبی حقائق سے ہو اور جس کا 'محسوسات کی دنیا' میں بہ راہ راست مشاہدہ نہ کیا جاسکتا ہو۔ مذہب اور حقائق غیبی کو خلاف عقل اور ناقابل قبول قرار دینے کے اس رویے کا نام 'سیکولرزم' ہے۔

فطری تقاضوں کا باہم ٹکراؤ

یورپ میں مذہب کے نام پر انسانوں کا استحصال ہو رہا تھا اور انسانوں پر اپنے ہی جیسے انسانوں کی جو حکومت قائم تھی، اس سے بچنے کے لیے وہاں کے اہل دانش نے مذہب کو قابل رد ٹھہرایا اور اپنے اس طرز فکر کے لیے 'سیکولرزم' کا عنوان تجویز کیا۔ اس طرح یورپ میں فطرت انسانی کے دو پہلو آپس میں ٹکرا گئے۔

(الف) فطرت انسانی کا یہ پہلو کہ وہ مذہبی واقع ہوئی ہے یعنی انسان فطرتاً روح کے وجود کا قائل ہے اور اسی طرح خالق کائنات کو اس کی فطرت پہچانتی ہے اور ماننا بھی چاہتی ہے۔

(ب) دوسری طرف فطرت انسانی کا یہ دوسرا پہلو کہ انسان ایسا معاشرہ چاہتا ہے، جس میں

انسان برابر ہوں، ایک انسان دوسرے پر خدائی نہ کرے، معاشرے میں عدل و انصاف قائم ہو، انسانوں کا استحصال نہ ہو اور ان کو غیر معقول باتیں ماننے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان دونوں پہلوؤں کے ٹکراؤ کی وجہ یہ تھی کہ جو مذہب یورپ میں موجود تھا (یعنی عیسائیت) وہ غیر معقول اور غیر عادلانہ تصورات کا حامل تھا۔ یورپ کے اہل دانش اس مشکل سے دوچار تھے کہ اگر وہ مذہب کو قبول کرتے ہیں (جس کا تقاضا ان کی انسانی فطرت کرتی ہے، جو مذہبی واقع ہوئی ہے) تو ان کو غیر معقول باتوں کو ماننا پڑتا ہے اور مذہبی طبقے کی حکمرانی قبول کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بالمقابل اگر وہ عقل اور معقولیت پر اصرار کرتے ہیں تو انھیں مذہب کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اس مرحلے پر یورپ کے دانش وروں نے مذہب کو چھوڑنا گوارا کر لیا اور اس خیال کی بنیاد رکھی کہ ”انسانی رویے کی بنیاد صرف عقل اور تجربے پر ہونی چاہیے“ اور یہ کہ غیب اور غیبی حقائق کے نام سے جو بات بھی پیش کی جائے، وہ قابل رد ہے، اس لیے کہ ایسی کوئی بات عقل اور مشاہدے کے ذریعے ثابت نہیں کی جاسکتی اور جو کچھ محسوس مشاہدے کے ذریعے ثابت نہیں کیا جاسکتا، وہ تسلیم کیے جانے کے قابل نہیں ہے۔

اگر اس مرحلے پر یورپ کے اہل دانش کے سامنے اسلام کا صحیح تصور آجاتا تو وہ اس مشکل سے بچ سکتے تھے۔ اسلام فطرت کے دونوں تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ انسان کا تعلق خدا سے قائم کرتا ہے اور اس کے مذہبی جذبات کی تسکین کا مکمل سامان فراہم کرتا ہے۔ دوسری طرف اسلام میں کوئی مذہبی طبقہ نہیں ہے، بلکہ تمام انسان اس کے اہل ہیں کہ بہ راہ راست خدا کی عبادت کریں، اس کی ہدایت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے دین کی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں۔ اسلام انسانوں کے درمیان مساوات اور بھائی چارہ قائم کرتا ہے اور انسانوں پر انسانوں کی خدائی کی کسی شکل کو گوارا نہیں کرتا۔ اسلام نے جو باتیں بھی پیش کی ہیں، وہ سب کی سب معقول اور مدلل ہیں اور وہ کسی غیر معقول بات کو تسلیم کرانے کی کوشش نہیں کرتا۔ اسی طرح اسلامی تعلیمات کے اندر انسانوں کے استحصال اور ظلم و ستم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کی یہ

خصوصیت بھی ہے کہ 'کلامِ الہی' محفوظ ہے اور اس کو پڑھنا اور سمجھنا ہر طالبِ ہدایت کا حق ہے اور فرض بھی۔ اس کلامِ الہی کے محفوظ و مامون ہونے کی بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ اس میں تحریف کی جاسکے یا اس کی مان مانی تشریحات کر کے ایک طبقہ دوسروں پر اپنا تسلط قائم کر سکے۔ جو فرد یا طبقہ بھی انسانوں پر اپنی خدا کی قائم کرنا چاہے گا، وہ اسلام کے حوالے سے ایسا نہ کر سکے گا، بلکہ اس کو اسلام سے بغاوت کرنی ہوگی۔ لیکن تاریخی و نفسیاتی اسباب کی بنا پر اہلِ یورپ اسلام پر غور نہ کر سکے، اس لیے یہ تاریخی حادثہ رونما ہوا کہ یورپ کی جدید صنعتی تہذیب کی بنیادُ خدا، مذہب اور غیب سے بغاوت پر رکھی گئی۔

سمجھوتہ

یہ سیکولرزم کی ابتدا تھی، جس میں مذہب کو رد کیا گیا۔ چنانچہ اس سیکولر رویہ اور طرزِ فکر کو الحاد کے ہم معنی قرار دیا جاسکتا ہے۔

لیکن الحاد کو انسانی فطرت قبول نہیں کرتی۔ انسانی فطرت کے اندر مذہب کی جو شدید پیاس موجود ہے وہ کسی ایسے نظامِ فکر سے نہیں بجھ سکتی جو مذہب کی نفی پر مبنی ہو۔ اس لیے سیکولرزم کا یہ مفہوم (جو الحاد کا ہم معنی تھا) صرف ایک محدود طبقے کے لیے ہی قابلِ قبول ہو سکا۔ عام طور پر جو مفہوم قابلِ قبول قرار پایا وہ یہ تھا کہ 'مذہب' کو اجتماعی معاملات سے الگ کر دیا جائے۔

سیکولرزم کے دو مفہوم

چنانچہ سیکولرزم کے دو مفہوم ہیں:

(۱) پہلا مفہوم یہ ہے کہ مذہب غیر معقول اور غلط ہے، اس لیے ہر معقول انسان کو چاہیے کہ مذہب کو رد کر دے۔

(۲) دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کی معقول تشریح نہیں کی جاسکتی، لیکن اس کے باوجود یہ انسان کی فطرت کا جز ہے۔ اس لیے مذہب کو رد کرنے کے بجائے اس کے دائرے کو

محدود کر دینا چاہیے اور تمام اجتماعی معاملات کو 'مذہب' کے اثر سے آزاد رکھنا چاہیے۔ اس طرح اجتماعی معاملات مذہب کی غیر معقولیت کے برے اثرات سے محفوظ رہیں گے اور عقل و تجربے کی بنیاد پر چلائے جائیں گے۔

سیکولرزم کا یہ دوسرا مفہوم دراصل ایک سمجھوتہ ہے۔ چوں کہ مذہبی جذبات کا خاتمہ اور استیصال ممکن نہیں ہے، لیکن مذہب کی غیر معقولیت بھی عیاں ہے، اس لیے یہی راستہ بچتا ہے کہ مذہب کے لیے بھی کچھ گنجائش نکال لی جائے۔ لیکن بہر حال اجتماعی معاملات کو مذہب سے الگ رکھنا چاہیے۔

انسانی فطرت کا سیکولر تصور

اس سمجھوتے کے پس منظر میں انسانی فطرت کا جو تصور ابھرتا ہے وہ یہ ہے:

(۱) فطرتِ انسانی متضاد عناصر کا مجموعہ ہے۔

(۲) ایک طرف انسانی فطرت مذہبی ہے (یعنی روح، خدا اور غیب کی قائل ہے) اور مذہبی جذبات کی تسکین چاہتی ہے، لیکن 'امرِ واقعہ' یہ ہے کہ یہ سارے تصورات غیر معقول ہیں، اس لیے کہ مشاہدے سے ثابت نہیں کیے جاسکتے، چنانچہ انسانی فطرت بعض غیر معقول تصورات کی قائل ہے۔

(۳) دوسری طرف انسانی فطرت 'معقول' بھی واقع ہوئی ہے، یعنی انسان بالعموم معاملات کو سمجھنا چاہتا ہے، دلائل دیتا ہے اور دلائل طلب کرتا ہے اور اجتماعی زندگی میں انسان مل جل کر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے جب تک کہ ایک دوسرے کو اپنے موقف کے بارے میں مطمئن نہ کر دیں (جبر و اکراہ کی بات دوسری ہے)۔

لیکن جو اصحابِ فکر 'سیکولرزم' کے (یعنی اس کے دوسرے مفہوم کے) قائل ہیں وہ مجبور ہیں کہ انسانی فطرت کا یہ عجیب و غریب تصور اپنائیں، جو دو متضاد عناصر پر مشتمل ہے۔

سیکولرزم اور اسلام

اسلام سیکولرزم کو (اس کے دونوں معنوں میں) غلط سمجھتا ہے اور رد کرتا ہے۔ پہلا تصور سیکولرزم یہ ہے کہ ”مذہب سرے سے غیر معقول اور ناقابل قبول ہے۔“ ظاہر ہے کہ اسلام کا یہ موقف نہیں ہے۔ اسلام مذہب (یعنی دین حق) کو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے۔

رہا دوسرا ’تصور سیکولرزم‘ تو وہ یہ ہے کہ ”اجتماعی معاملات کو مذہب سے الگ رکھا جائے۔“ وہ اس تصور کو بھی رد کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک اللہ کی ہدایت زندگی کے ہر معاملے میں واجب الاتباع ہے۔ اس ہدایت کو زندگی کے بعض گوشوں تک محدود نہیں رکھا جاسکتا۔

اس موقف پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور ہمیشہ رہا ہے۔ ہر دور کے علماء نے اس کی صراحت کی ہے کہ دین کا تعلق پوری زندگی سے ہے، جس میں عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معیشت، معاشرت، تعلیم، قانون، صلح و جنگ، طرز سیاست اور بین الاقوامی تعلقات سمیت تمام شعبے شامل ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے سیکولرزم کو قبول کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، خواہ اس کا کوئی بھی مفہوم لیا جائے۔

سیکولر اسٹیٹ

سیکولر اسٹیٹ کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے اس امر واقعہ کو سمجھنا ضروری ہے کہ موجودہ زمانے کی اکثر ریاستیں اپنے تصور کے مطابق ’نیشن اسٹیٹ‘ (Nation State) ہیں۔ یوں تو ہر ریاست زمین کے کسی علاقے تک محدود ہوتی ہے، لیکن نیشن اسٹیٹ کا مفہوم صرف اتنا نہیں ہے کہ وہ ایک خطے تک محدود ہو، کیوں کہ ایک خطہ زمین تک محدود ہونا تو صرف ایک امر واقعہ ہے۔ نیشن اسٹیٹ کا اصل مفہوم یہ ہے کہ وہ اصولاً صرف اپنی حدود میں رہنے والے

’اصل باشندوں‘ کو ہی اپنا شہری سمجھتی ہے اور صرف ان کو ہی شہری حقوق دیتی ہے (جن میں ’انتظام ملکی میں شرکت‘ کا حق بھی شامل ہے)۔

نیشن اسٹیٹ کے بالمقابل اصطلاح ’نظریاتی ریاست‘ (Ideological State) کی ہے۔ نظریاتی ریاست کی مکمل مثال تو صرف ’اسلامی ریاست‘ ہے، البتہ کسی حد تک کمیونسٹ ریاست بھی نظریاتی کہلا سکتی ہے۔ نظریاتی ریاست بھی (کسی ایک خاص وقت میں) ایک خطہ زمین تک محدود ہوتی ہے، لیکن اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شہریت کی بنیاد ’نظریے سے وابستگی‘ ہوتی ہے، نہ کہ محض ایک خطہ زمین کا باشندہ ہونا۔ چنانچہ اصولاً ہر مسلمان اسلامی ریاست کا مکمل شہری ہوتا ہے۔ (بشرطے کہ وہ ہجرت کر کے اس کی حدود میں آجائے) اور ایک غیر مسلم اگرچہ اسلامی ریاست کے اندر رہ سکتا ہے، لیکن وہ انتظام ملکی کے کلیدی کام میں شریک نہیں ہوتا (اگرچہ دوسرے تمام شہری حقوق اس کو حاصل ہوتے ہیں)۔

’نیشن اسٹیٹ‘ کی تعریف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اصولاً اپنے شہریوں کے درمیان مذہبی فرق کو ناقابل لحاظ سمجھتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے نزدیک ’مذہب ایک ناقابل لحاظ چیز ہے‘۔ یہی سیکولر نقطہ نظر ہے (جس کے مطابق مذہب کو اجتماعی معاملات سے الگ رکھا جانا چاہیے)۔ چنانچہ نیشن اسٹیٹ کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ وہ ’سیکولر اسٹیٹ‘ بن جائے۔ اس لیے موجودہ زمانے کی قومی ریاستوں (Nation States) کا سیکولر ریاست ہونا کوئی اتفاقی بات (Accident) نہیں ہے، بلکہ نیشن اسٹیٹ ہونے کا عین تقاضا ہے۔ اگر کوئی ریاست نظریاتی ریاست نہیں ہوگی تو وہ لازماً نیشن اسٹیٹ ہوگی۔

(جو قارئین نیشن اسٹیٹ کی اس خصوصیت کے سلسلے میں مطالعہ کرنا چاہیں، ان کے

لیے گری لال جین کا مضمون دل چسپی کا باعث ہوگا، جو The Hindu Phenomenon میں

شائع ہوا ہے)

سیکولر نیشن اسٹیٹ کی پیچیدگی

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، کسی ریاست کے نیشن اسٹیٹ کے بنیادی معنی یہ ہیں کہ اس میں شہریت کی بنیاد صرف اس خطہ زمین کا باشندہ ہونا ہے۔ چنانچہ کسی شخص کا مذہب اس کی شہریت کے سلسلے میں زیر بحث نہیں ہوتا اور ہر شہری کو بلا لحاظ مذہب انتظامِ ملکی میں شرکت کا حق حاصل ہوتا ہے۔

نیشن اسٹیٹ کی تعریف سے یہ معنی بھی نکلتے ہیں کہ جس طرح ہر شہری کو ملکی انتظام میں شرکت کا حق حاصل ہے، خواہ اس کا مذہب کچھ بھی ہو، اسی طرح خواہ اس کا نظریہ (Ideology) کچھ بھی ہو، اسے ملکی انتظام میں شرکت کا حق حاصل ہوگا۔

مندرجہ بالا خصوصیت کا یہ تقاضا ہے کہ نیشن اسٹیٹ کا خود کوئی نظریہ نہ ہو۔ اگر اس کا اپنا کوئی نظریہ ہو تو وہ مخالف نظریات رکھنے والے شہریوں کو انتظامِ ملکی میں شرکت کے مساوی حقوق نہیں دے سکتی۔

اس نکتے کو سمجھ لینے کے بعد نیشن اسٹیٹ کی عملی پیچیدگی بیان کی جاسکتی ہے، جس کا ہر نیشن اسٹیٹ کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اصولاً 'نیشن اسٹیٹ' کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ سادہ جمہوری نیشن اسٹیٹ ہوتی ہے (جس میں ہر شہری کو حق حاصل ہوتا ہے کہ جس نظریے کا رنگ بھرنا چاہے، بھرنے کی کوشش کرے)۔ لیکن عملاً تاریخی اسباب کی بنا پر ہوتا یہ ہے کہ ہر ریاست اپنا ایک 'نظریاتی رنگ' رکھتی ہے (خواہ وہ تسلیم کرے یا نہ کرے) اور یہ نظریاتی رنگ اس ریاست کے دستور، نظامِ تعلیم، سرکاری میڈیا، پالیسیوں، تقریبات اور نعروں غرض ہر چیز میں جھلکتا ہے۔ اس 'نظریاتی رنگ' میں ریاست کے تمام باشندوں کو رنگنے کے لیے ریاست کی پوری مشینری (Machinery) کوشش کرتی ہے۔ جو باشندے اس نظریاتی رنگ سے اتفاق نہ رکھتے ہوں وہ اصولاً تو سارے شہری حقوق رکھتے ہیں، لیکن عملاً زمین ان کے لیے تنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا صرف کسی تعصب کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ 'نظریاتی رنگ' کی موجودگی کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ ریاست ان نظریات کو مٹانے کی کوشش کرے جو اس کے اپنے پسندیدہ نظریے سے مختلف ہوں۔

ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ

مثال کے طور پر آپ یہ جائزہ لے سکتے ہیں کہ ہندوستان کی سیکولر نیشن اسٹیٹ کا 'نظریاتی رنگ' کیا ہے؟ غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظریاتی رنگ کئی عناصر کا مجموعہ ہے، جن میں باہم متضاد عناصر بھی شامل ہیں:

- (۱) وطنی قومیت کا تصور
- (۲) مشترک کلچر کا تصور (جو کلچرل نیشنلزم کی طرف مائل ہو جاتا ہے)
- (۳) حاکمیتِ جمہور
- (۴) گاندھی ازم
- (۵) مغرب کے لبرل تصورات، خصوصاً برطانیہ اور فرانس کی جمہوری روایات
- (۶) مذہب اور اجتماعی معاملات کی علیحدگی کا تصور

ہندوستان کی ریاست پوری کوشش کرتی ہے کہ اپنے مندرجہ بالا 'نظریاتی رنگ' میں پوری آبادی کو رنگ دے۔ ظاہر ہے کہ وہ باشندے، جو خود اپنا ایک نظریہ رکھتے ہیں، ان کے لیے ریاست کی یہ کوششیں تکلیف دہ بھی ہیں اور پریشان کن بھی۔ البتہ ریاست کا یہ ظلم ایسا ہے کہ اس کو ظلم ثابت کرنا بھی مشکل ہے، اس لیے کہ 'سیکولر نیشن اسٹیٹ' کو ایک صحیح نظام تسلیم کر لینے کے بعد ریاست کو اپنے اختیارات کے استعمال سے نہیں روکا جاسکتا۔

اب سیکولر نیشن اسٹیٹ چوں کہ 'جمہوری' ہے، اس لیے وہ اپنے کو عوام کا نمائندہ کہتی اور سمجھتی ہے۔ چنانچہ ریاست کے جو بھی اقدامات ہیں وہ خود عوام کے اقدامات قرار پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ عوام کا ایک طبقہ ان اقدامات پر کیسے احتجاج کر سکتا ہے جو خود عوام نے ہی کیے ہوں۔

اس ساری پیچیدگی کی بنیاد یہ غلط مفروضہ ہے کہ ریاست کے تمام باشندے اپنے خیالات اور طرز فکر میں ایک جیسے ہیں اور ان کے درمیان مذہب یا نظریے کا فرق محض جزوی و فروعی نوعیت رکھتا ہے اور ناقابل لحاظ ہے۔ واقعہ اس مفروضے کی تصدیق نہیں کرتا۔ ریاست میں

فی الواقع متعدد مذاہب کے پیرو موجود ہیں اور ان کے درمیان طرز زندگی اور تصورات کا فرق فروعی نہیں ہے، بلکہ اساسی اور بنیادی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ بادل نا خواستہ سیکولر اسٹیٹ ان مذاہب اور نظریات کے وجود کو تسلیم بھی کر لیتی ہے، جو ریاست کے 'نظریاتی رنگ' سے مختلف کوئی تصویر حیات رکھتے ہیں۔ البتہ ایسے گروہوں کو 'اقلیت' کہتی ہے۔ ان گروہوں کو 'نظریاتی گروہ' کہنے کے بجائے 'اقلیت' کہنا اور ان کے حقوق کی حفاظت کے لیے کچھ دستوری و قانونی تحفظات فراہم کرنا دراصل یہ معنی رکھتا ہے کہ:

(۱) ایک 'اکثریت' بھی موجود ہے (ورنہ 'اقلیت' کی اصطلاح کے کوئی معنی نہیں ہیں) اس 'اکثریت' سے ظلم و زیادتی عین متوقع ہے، چنانچہ کچھ 'تحفظات' کی ضرورت ہے، تاکہ اقلیتوں کے حقوق محفوظ رہ سکیں۔

(۲) یہ مفروضہ کہ باشندگان ملک طرز حیات کے اعتبار سے یکساں ہیں، حقیقتاً غلط ہے، لیکن اس غلطی کو سیکولر ریاست صاف صاف تسلیم نہیں کرتی، بلکہ اقلیتوں کو کچھ حقوق بادل نا خواستہ دے دیتی ہے۔

(۳) اس بے دلی کی بنا پر یہ حقوق ہمیشہ خطرے میں رہتے ہیں اور یہ اندیشہ ہر وقت رہتا ہے کہ وہ ختم کر دیے جائیں۔

(۴) اگر حقوق ختم نہ بھی کیے جائیں، تب بھی بے دلی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں، اس لیے کہ ریاست کے بنیادی تصور (یعنی نیشنلزم) سے یہ حقوق متضاد ہیں۔ اس رویے کی بنا محض تعصب نہیں ہے، بلکہ ریاست کی نوعیت اسی رویے کی ترغیب دیتی ہے۔

(۵) اقلیتوں پر مستقل یہ احسان جتایا جاتا رہتا ہے کہ ان کو کچھ حقوق سیکولر ریاست نے 'ازراہ عنایت' دے رکھے ہیں اور یہ اس کی بڑی فیاضی ہے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے اور کسی فرد یا ریاست کو یہ حق نہیں ہے کہ انسانوں کی آزادی سلب کر لے (جس میں عقیدے اور دین کی آزادی شامل ہے)۔ اگر وہ آزادی سلب نہ کرے اور انسانوں کو ان کے حقوق دے دے تو یہ کوئی احسان نہیں ہے۔

(۶) اقلیت کی اصطلاح میں زور کسی گروہ کی 'تعداد' پر ہے نہ کہ اس کے نظریے پر۔ جس گروہ کو 'اقلیت' کہا جاتا ہے اس کی اپنی نگاہ میں اس کی تصویر یہ بنتی ہے کہ وہ محض ایک قلیل التعداد گروہ ہے۔ اس کی یہ تصویر نہیں بنتی کہ وہ ایک نظریے کا علم بردار ہے۔ حالاں کہ یہ ممکن ہے کہ اگر نظریے میں قوت ہو تو ایک قلیل التعداد گروہ بھی موثر کردار ادا کر سکے۔ نظریہ کو یہ ثانوی اور فروعی مقام دینا نیشن اسٹیٹ کے تصور کے عین مطابق ہے۔ مسلمانوں کو جو دقتیں ہندوستان میں پیش آتی ہیں، اس کی اصل وجہ سیکولر نیشن اسٹیٹ کا 'نظریاتی رنگ' ہے، جس میں وہ مسلمانوں کو بھی رنگے کی کوشش کرتی ہے۔ ان دقتوں میں مزید اضافہ اس تعصب سے ہوتا ہے جب یہاں موجود ہے۔ لیکن بہ ہر حال دقتوں کی اصل وجہ تعصب نہیں ہے، بلکہ سیکولر نیشن اسٹیٹ کی مخصوص نوعیت ہے۔

سیکولر اسٹیٹ نہ ہو تو کیا ہو؟

سوال کیا جاسکتا ہے (اور کیا جاتا ہے) کہ ہندوستان جیسے ملک میں، جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں، وہاں سیکولر اسٹیٹ کے قیام کے علاوہ آخر اور کیا چارہ کار ہے؟ بہ الفاظِ دیگر سیکولر اسٹیٹ کا متبادل کیا ہے؟

اس سوال کے جواب میں عرض کیا جاسکتا ہے کہ سیکولر اسٹیٹ کا متبادل یہ ہے:

- (۱) ریاست کو روایتی معنوں میں جمہوری کہنے کے بجائے اُسے مختلف مذہبی گروہوں کی مشترکہ ریاست سمجھا جائے، جس کی بنیاد ان گروہوں کے درمیان آزاد معاہدے پر ہو۔
- (۲) ریاست اپنی حدود میں مختلف مذاہب اور ان کے پیرو گروہوں کی موجودگی کشادہ دلی کے ساتھ تسلیم کرے، نہ کہ ایک ناگوار واقعے کے طور پر۔ (اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وطنی قومیت اور مشترکہ کلچر و تہذیب کے نصب العین سے دست بردار ہو جائے اور سوسائٹی کو Secularize کرنے کا خیال چھوڑ دے)۔
- (۳) ہر مذہبی گروہ کے لیے مذہب پر عمل کی انفرادی آزادی کے علاوہ اپنے گروہ کی اجتماعی

زندگی کو مذہب کے مطابق منظم کرنے کی آزادی بھی تسلیم کی جائے۔

(۴) ہر گروہ کو یہ حق ہو کہ وہ اپنا نظامِ تعلیم اپنے کنٹرول میں رکھ سکے اور عام وسائلِ ریاست سے اس کو اتنا حصہ مل جائے جو اس کی آبادی کے متناسب ہو۔

(۵) کسی شخص کو از روئے قانون یا حکومتی دباؤ سے کام لے کر ایسے کام پر مجبور نہ کیا جائے جو اس کے دین کے منافی ہو۔

ہندوستان میں مسلمانوں کو چاہیے کہ سیکولرزم کی علمی تردید کے علاوہ ریاست پر زور دیں کہ وہ مذہبی گروہوں کے وجود کو تسلیم کرے اور ان کے لیے مذہب پر عمل کے انفرادی حق کے علاوہ اجتماعی حق کو بھی تسلیم کرے۔ اس طرح ایک منصفانہ صورت قائم ہو سکے گی۔

جارحانہ قوم پرستی۔ ایک تجزیہ

ہمارے ملک میں جارحانہ قوم پرستی کی ایک طاقت و تحریک موجود ہے، جو اپنے کو ہندو تو کا علم بردار کہتی ہے۔ اس تحریک کا خاص نشانہ مسلمان ہیں۔ پچھلی تین دہائیوں میں ملک میں ایسے واقعات پے درپے پیش آئے ہیں جو بتاتے ہیں کہ ہندو تو کے علم برداروں نے مسلمانوں کے جان و مال اور اسلامی شعائر پر یلغار کر دی ہے۔ حکومت کی مشنری یا تو خاموش تماشائی ہے یا ان کا ساتھ دے رہی ہے۔ اس صورت حال میں مسلمانوں کو اور منصف مزاج اہل ملک کو کیا کرنا چاہیے؟ یہ سوال درپیش ہے۔

جارحانہ قوم پرستی کے رجحان کے علم بردار ترقی کا نعرہ لگاتے ہیں، لیکن یہ بات اب تک واضح نہیں ہے کہ پورے ملک کو درپیش سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے لیے وہ کیا حل پیش کرتے ہیں؟ البتہ مسلمانوں سے ان کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے عقائد، شعائر، تہذیب اور ثقافت سے دست بردار ہو جائیں اور اکثریت کے کلچر میں جذب ہو جائیں۔ غالباً یہی ہندو تو کی کل حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ عوام کے لیے یا ملک کے لیے کوئی مثبت پروگرام انھوں نے پیش نہیں کیا ہے۔

مسلمانوں سے اپنا مطالبہ منوانے کے لیے جارحانہ قوم پرستی کی علم بردار طاقتوں کا طریقہ کاریہ ہے کہ مفید عناصر مسلمانوں پر حملے کرتے ہیں، ان کو جانی و مالی نقصان پہنچاتے ہیں، مساجد کو مسمار کرتے ہیں اور اس طرح وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں اور وہ ڈر کر اکثریت کے کلچر میں شمولیت قبول کر لیں۔ یہ طریقہ کار جبر و اکراہ پر مشتمل ہے۔

قوم پرستی کی دلیل

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر جبر و اکراہ کا استعمال کیوں کیا جا رہا ہے؟ قوم پرستی کے علم بردار جواب میں کہتے ہیں کہ نیشنلزم اور سیکولرزم کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بتدریج ہی سہی، قومی کلچر میں جذب ہو جاتے (مثلاً اپنے الگ پرسنل لا سے دست بردار ہو جاتے) لیکن مسلمان اکثریت کے کلچر میں جذب نہیں ہو رہے ہیں اور اپنے جداگانہ تہذیبی تشخص پر اصرار کیے جاتے ہیں۔ مزید برآں قوم پرستی کے علم برداروں کی شکایت یہ ہے کہ سیکولر کہلانے والی سیاسی پارٹیاں اپنی سیاسی اغراض اور ووٹوں کی خاطر مسلمانوں کی اس 'بے جا روش' کو نہ صرف برداشت کرتی ہیں، بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔

قوم پرستی کے حامیوں کے نزدیک یہ رویہ نقلی سیکولرزم (Pseudo Secularism) ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی بے جا ضد، اپنے تشخص پر اصرار اور سیاسی پارٹیوں کا اس ضد کو برداشت کرنا، یہ سب بہت دنوں سے گوارا کیا جا رہا ہے۔ اب صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کو جبر و اکراہ کے ذریعے 'قومی کلچر' میں جذب کر لیا جائے۔

یہ وہ دلیل ہے جو سیکولر افراد کو بھی اپیل کرتی ہے، اس لیے کہ مختلف وجوہ سے مسلم پرسنل لا اور مسلمانوں کا جداگانہ تہذیبی وجود ان کو بھی کھٹکتا ہے، البتہ ان کی بڑی تعداد مقصد کے حصول کے لیے جبر و اکراہ کا طریق کار اختیار کیے جانے کی تائید نہیں کرتی۔

وسیع تر منصوبہ

ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا الگ دینی و تہذیبی وجود ختم کر دینا قوم پرستی کے علم برداروں کا آخری مقصد ہے، یا یہ ان کے مقصد کی راہ کا صرف ایک مرحلہ ہے؟ غور کرنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانی سماج اور خصوصاً اُس کے پست کردہ طبقے پر اقتدار حاصل کرنا اور قائم رکھنا ان کا آخری مقصد ہے اور مسلمانوں کو جذب کر لینے یا غیر مؤثر بنادینے کا کام اس مقصد کی راہ میں صرف ایک مرحلہ ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک

طریق کار ہے، جو انھوں نے اختیار کیا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا کر اور ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خیالی خوف دلا کر وہ اکثریت کو ہندو تو کے علم برداروں کے پیچھے جمع کر سکتے ہیں اور اس طرح ان پر اپنا اقتدار قائم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ سماج میں عدم مساوات کا جو نظام قائم ہے، وہ بدستور قائم رہے۔ اس نظام کی بدولت سیاسی اقتدار کی عدم موجودگی میں بھی سماجی اقتدار ان کو حاصل رہتا ہے۔ ان کے خیال میں مسلمان اس سماجی ڈھانچے کے لیے خطرہ ہیں یا مستقبل میں بن سکتے ہیں، چنانچہ ان کو غیر موثر بنانا ضروری ہے۔

اس تجربہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندو تو کا وسیع تر نشانہ سماج کی اکثریت ہے، جو سیاسی، سماجی اور معاشی محرومی کا شکار ہے۔ اس تحریک کے علم بردار چاہتے ہیں کہ یہ محرومی باقی رہے اور ان کا سماجی اقتدار قائم رہے۔ مزید برآں سیاسی اقتدار بھی قائم ہو جائے۔ اس آخری منزل کے حصول کے لیے فی الحال انھوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنایا ہے، تاکہ مسلمان سماجی ظلم کے خلاف کوئی موثر چیلنج نہ بن سکیں۔ اُن کا اندازہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلا کر قوم پرستی کے پیروؤں کی تعداد میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

نفوذ کا طریق کار

عوام کو ساتھ لینے کے لیے جارحیت کے علم برداروں نے نفرت پھیلانے اور مسلمانوں کی خیالی طاقت سے ان کو خوف زدہ کرنے کے علاوہ درج ذیل چیزوں کا سہارا لیا ہے:

(الف) شرک اور اداہام پرستی، جو سماج میں وسیع پیمانے پر رائج ہے۔

(ب) مسلمانوں کے مبینہ مظالم کا تذکرہ، جو انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں کیے۔

(ج) جارحانہ نیشنلزم کا تصور، جسے اب ’کلچرل نیشنلزم‘ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے مطابق

سارے ملک کے باشندوں کا ایک کلچر میں رنگ جانا نیشنلزم کا تقاضا ہے۔

جارحانہ قوم پرستی کے علم بردار ایک سیلاب کی شکل میں سامنے آئے ہیں۔ انھوں نے

بہ یک وقت مذہبی، سماجی اور سیاسی محاذوں پر کام شروع کیا ہے۔ باشعور افراد کو گہرے غور و فکر سے

کام لے کر اس تحریک کا تجزیہ کرنا چاہیے، پھر حالات کی اصلاح کے لیے طریق کار ترتیب دینا

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

چاہیے۔ وسیع پیمانے پر تبادلہ خیال اور مشوروں کے بعد ایک جامع لائحہ عمل بنایا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں غور و فکر کا آغاز قوم پرستی کے بنیادی مطالبے سے کرنا چاہیے۔

مسلمانوں سے اس تحریک کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے پرسنل لا سے دست بردار ہو جائیں اور ایک اجتماعی وجود کی طرح اپنا سیاسی وزن ڈالنا چھوڑ دیں۔ جہاں تک سیاسی معاملات (ووٹ ڈالنے وغیرہ) کا تعلق ہے، مسلمان فرد فرد بن کر رہیں، ان کا کوئی اجتماعی رویہ نہ ہو۔ گویا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان چاہیں تو ذاتی زندگی میں مسلمان رہیں، لیکن معاشرتی اور سیاسی زندگی میں اسلام کو ترک کر دیں اور ملت ہونے کے احساس سے عملاً عاری ہو جائیں۔

اس مطالبے کے جواب میں مسلمان عموماً یہ کہتے ہیں کہ اپنے مذہب پر قائم رہنا ہمارا دستوری حق ہے، ملک کا ڈھانچہ سیکولر ہے، اس نے ہمیں اجازت دی ہے کہ ہم اپنے دین و تہذیب پر قائم رہیں۔ ہم اپنے اس دستوری حق سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ مزید برآں سیکولرزم کے معنی بھی یہی ہیں کہ ہمیں اپنے مذہب پر عمل کا حق حاصل ہو۔

یہ جواب اب تک کارگر ثابت ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس میں ایک بنیادی کم زوری ہے۔ مسلمان سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سیکولرزم کا تقاضا یہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ہر مذہبی گروہ آزاد ہو۔ چوں کہ پرسنل لا ہمارا مذہبی معاملہ ہے، اس لیے ہمارا پرسنل لا محفوظ رہنا چاہیے۔ کسی کو حق نہیں کہ ہم کو ہمارے پرسنل لا سے محروم کر کے کامن سول کوڈ ہم پر نافذ کر دے۔

لیکن قوم پرستی کے قائل کہتے ہیں کہ بے شک سیکولرزم کے معنی یہ ہیں کہ مذہبی معاملات میں مسلمان سمیت تمام مذہبی گروہ آزاد ہوں، کوئی ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہ کرے۔ لیکن پرسنل لا مذہبی معاملہ نہیں ہے۔ مذہبی معاملات تو مراسم عبادت وغیرہ ہیں، اس لیے سیکولرزم کا ہی تقاضا ہے کہ کامن سول کوڈ نافذ کیا جائے۔ اس سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ شاہ بانو مقدمے پر مباحثے کے دوران ملک میں جو بحث چلتی رہی، اس میں ہندو تو کے علم بردار اور سیکولر افراد سب ایک طرف تھے اور مسلمان دوسری طرف۔ سیکولر افراد کا کہنا بھی یہی تھا کہ پرسنل لا مذہبی معاملہ نہیں ہے۔

سیکولرزم کی تعبیر

یہاں پہنچ کر ہم اس سوال سے دوچار ہو جاتے ہیں جس کا تعلق سیکولرزم کے مفہوم سے ہے۔ مسلمانوں، ہندوؤں کے علم برداروں اور سیکولر پارٹیوں، تینوں کا لفظ 'سیکولرزم' پر اتفاق ہے، لیکن اس کا مفہوم ان سب کے ذہن میں الگ الگ ہے۔ ان میں اس حد تک تو اتفاق ہے کہ انسانی زندگی کے بعض معاملات مذہبی ہوتے ہیں اور بعض غیر مذہبی، پھر اس بات پر بھی ان میں اتفاق ہے کہ مذہبی معاملات میں ہر گروہ کو آزادی ملنی چاہیے اور غیر مذہبی معاملات میں سب کا طرز عمل یکساں ہونا چاہیے اور ایسا ہونا چاہیے جیسا کہ ریاست یا اس کا با اختیار ادارہ (پارلیمنٹ وغیرہ) طے کرے، لیکن یہاں پہنچ کر ان میں اختلاف ہو جاتا ہے کہ مذہبی معاملات کون سے ہیں اور غیر مذہبی کون سے؟ مثلاً مسلمان پرسنل لا کو مذہبی معاملہ قرار دیتے ہیں، جب کہ ہندوؤں کے علم بردار اور سیکولر پارٹیاں اسے غیر مذہبی معاملہ سمجھتی ہیں۔ یہاں پہنچ کر باہم شکوہ شروع ہوتا ہے۔ مسلمان ہندوؤں اور سیکولرزم کے علم برداروں سے شکی ہوتے ہیں کہ تمہارا رویہ سیکولر نہیں ہے۔ ہندوؤں کے حامی مسلمانوں اور 'سیکولر' پارٹیوں دونوں سے شکوہ کرتے ہیں کہ تمہارا سیکولرزم نقلی ہے۔ جبکہ اصل وقت یہ ہے کہ خود سیکولرزم کے لفظ میں ابہام ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم واضح اور متعین نہیں ہے۔ اس بات پر کوئی اتفاق نہیں پایا جاتا کہ مذہب کے دائرے میں زندگی کے کون سے امور آتے ہیں اور کون سے نہیں آتے۔ اس لیے ایک گروہ لفظ سیکولرزم کا استعمال کر کے جو کچھ کہتا ہے، دوسرا گروہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اس ابہام کا فائدہ جارحانہ قوم پرستی کے حامیوں کو پہنچ رہا ہے۔ وہ غیر مذہبی معاملات کا دائرہ وسیع تر کرنا چاہتے ہیں اور اس میں عقائد و عبادات تک کو شامل کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں تک محض لفظ سیکولرزم کا تعلق ہے، اس میں اس طرز عمل کی گنجائش نکلتی ہے۔

ابہام کی کیفیت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ اس سے زیادہ پیچیدگیوں کا باعث بنتی ہے۔ جواب دینے کی حد تک تو مسلمان یہ جواب دے دیتے ہیں کہ سیکولرزم کا تقاضا ہے کہ ہم مذہبی معاملات میں آزاد ہوں اور غیر مذہبی معاملات میں ریاست کے پابند ہوں، لیکن فی الحقیقت

عصر حاضر کے پرفریب نعرے

مسلمانوں کی نفسیات کے اندر مذہبی اور غیر مذہبی معاملات کی کوئی تقسیم نہیں پائی جاتی۔ ان کی نفسیات کی تشکیل اسلامی سانچے میں ہوئی ہے۔ اسلام زندگی کی مذہبی اور غیر مذہبی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اس کے نزدیک پوری زندگی میں انسان کو اللہ کا بندہ بن کر رہنا چاہیے۔

اس لیے مسلمان کہتے تو صرف اتنا ہیں کہ ہمارا پرسنل لا محظوظ رہنا چاہیے، اس لیے کہ وہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے، لیکن ان کے شعور اور لاشعور میں یہ ارادہ و تمنا موجود ہوتی ہے کہ وہ پوری زندگی میں دین پر عمل کریں۔ یہ چیز ان کے طرزِ عمل سے بھی جھلکتی ہے۔ وہ سیاسی طرزِ عمل (مثلاً کسے ووٹ دیا جائے؟) طے کرتے وقت بھی بہ حیثیت مسلمان ایک رویہ اپنانا چاہتے ہیں جب کہ رائج الوقت تصورات کے مطابق ووٹ دینا کسی صورت سے مذہبی معاملہ نہیں قرار پا سکتا۔

اس صورت حال کی بنا پر ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کرتا ہے، وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ مسلمانوں کا طرزِ عمل غیر سیکولر ہے۔ یعنی یہ کہ وہ فی الواقع زندگی کی مذہبی اور غیر مذہبی تقسیم کو تسلیم نہیں کرتے۔ گو کہ ان کی باتیں سیکولر ہیں، یعنی گفتگو میں وہ سیکولرزم کا نام لیتے ہیں اور اپنی مذہبی آزادی کے لیے 'سیکولرزم' کے نعرے کو بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں۔

اب اگر مشاہدہ کرنے والا مسلمانوں سے عداوت رکھتا ہو تو وہ صاف کہتا ہے کہ مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل عیاری اور منافقت پر مبنی ہے۔ وہ سیکولرزم کا فائدہ تو اٹھانا چاہتے ہیں، (یعنی اپنی جان و مال کی حفاظت چاہتے ہیں) لیکن اس کی قیمت نہیں ادا کرنا چاہتے۔ (مثلاً پرسنل لا سے دست بردار نہیں ہونا چاہتے اور سیاست میں ایک بلاک کی طرح کام کرنے سے باز نہیں رہنا چاہتے۔) اگر مشاہدہ کرنے والا مسلمانوں سے عداوت نہیں رکھتا تو وہ ان کے طرزِ عمل کی یہ تاویل کرتا ہے کہ ان کا یہ رویہ محض انتشارِ ذہنی (Confusion) کی وجہ سے ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ واقعی سیکولر ہوتے جائیں گے۔ بہ ہر صورت جارحانہ قوم پرستی کے علم برداروں کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں نے سیکولرزم کا نام صرف حربے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

درست رد عمل

بحث کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ قوم پرستی کی جارحانہ تحریک نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ

کر رکھا ہے کہ وہ اپنے پرسنل لا سے دست بردار ہو جائیں، اپنے تشخص پر مُصر نہ ہوں اور سیاسی میدان میں ایک بلاک کے طور پر کام نہ کریں۔ مسلمان یہ مطالبہ نہیں مانتے اور سیکولرزم کو بہ طور دلیل پیش کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ جواب کم زور ہے اور مزید پیچیدگیاں پیدا کرتا ہے۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ پھر اس مطالبے کا صحیح جواب کیا ہے، جس سے پیچیدگیاں نہ پیدا ہوں؟ اسلامی مزاج کے مطابق صحیح جواب یہ ہے کہ مسلمان اہل ملک کو بتائیں کہ ہم اسلام سے دست بردار نہیں ہو سکتے، اس لیے کہ یہ کائنات کے حاکم و مالک کا نازل کیا ہوا دین ہے۔ مالک کائنات نے زندگی کے ہر گوشے کے لیے احکام دیے ہیں، اس لیے زندگی کی تقسیم غلط ہے، اس کے احکام تمام انسانوں کے لیے واجب التحمل ہیں، وہ خدا پوری دنیا کا بلا استثناء مالک ہے، اس لیے خواہ انسان ہندوستان میں رہتا ہو یا دنیا کے کسی اور خطے میں، اسے خدا ہی کی بندگی کرنی چاہیے۔ مسلم پرسنل لا اسلامی شریعت سے ماخوذ ہے، جو اللہ کے احکام کا نام ہے، اس لیے مسلمان اس سے دست بردار نہیں ہو سکتے، نیز یہ کہ انسانوں کے اشتراکِ عمل کی فطری، صحیح اور معقول بنیاد اشتراکِ عقیدہ اور اشتراکِ نظریہ زندگی ہے، اس لیے مسلمانوں کا ایک اجتماعی وجود کی طرح کام کرنا بالکل معقول ہے۔ اس کے برخلاف انسانوں کو مجبور کرنا کہ وہ اپنے عقائد و تصورات کے علی الرغم اکثریت کی مرضی کی پیروی کریں، ایک نامعقول طرزِ عمل ہے۔“

یہ جواب سلیقہ اور استدلال کے ساتھ دیا جائے تو کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی اور مسلمانوں کی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔

لیکن مسلمان یہ جواب اس وقت دے سکتے ہیں، جب کہ وہ اپنے ایمان کو زندہ ایمان بنائیں، خوابیدہ ایمان نہیں۔ حالات کا اشارہ واضح ہے۔ مسلمان اگر خالص اور مکمل اسلام سے وابستگی کا ارادہ، اعلان اور اظہار نہیں کرتے تو قوم پرستی کا سیلاب اس کے درپے ہے کہ ان کو مکمل طور پر قومی دھارے میں بہا لے جائے اور سیکولرزم کا تصور اتنا کم زور اور مبہم ہے کہ اس سیلاب کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا۔ اپنے تشخص کی حفاظت کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ مسلمان اپنے ایمان کو زندہ اور بیدار ایمان بنائیں۔

اللہ کی طرف دعوت

ایک صاحب ایمان شخص مندرجہ بالا جواب دے گا تو وہ انسانوں کو اللہ کی بندگی کی طرف دعوت بھی دے گا۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلمان اسلام کو حق سمجھنے کی بنا پر اسلام سے چٹے رہنا چاہتے ہوں اور دوسرے انسانوں کے ہی خواہ بھی ہوں، لیکن پھر بھی اُن کو حق کی طرف نہ بلائیں۔ اس حقیقت کو سمجھ لینے سے اس سوال کا جواب بھی مل جاتا ہے کہ اسلام سے شدید محبت کے باوجود مسلمان، دوسرے انسانوں کو اسلام کی طرف کیوں نہیں بلاتے؟

صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان اپنے تحفظ کے لیے سیکولرزم کے نعرے کا سہارا لیتے ہیں، یا سیکولرزم کو اپنی مذہبی آزادی کے لیے بہ طورِ دلیل پیش کرتے ہیں اور اس کی دُہائی دے کر اپنے جان و مال کے تحفظ کی ضمانت چاہتے ہیں۔ سیکولرزم اس بات کا نام ہے کہ زندگی کے بعض معاملات مذہب کے دائرے سے خارج ہوں۔ (گو اس امر میں اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے کہ وہ معاملات کون سے ہیں؟) اسلام کا تصور اس کے برعکس ہے اور وہ مذہبی و غیر مذہبی معاملات کی کوئی تقسیم نہیں کرتا۔ اس بنا پر عقلاً یہ ناممکن ہے کہ مسلمان سیکولرزم سے وابستگی کی بات بھی کریں اور اسلام سے وابستگی کی بھی۔

ظاہر ہے کہ دعوتِ الی اللہ کا کام ہو یا مسلمانوں کے تحفظ کا، دونوں کے لیے غیر مسلموں سے ربط و گفتگو ضروری ہے۔ اب اسلام اور سیکولرزم دونوں سے ہم آہنگ گفتگو بہ یک وقت تو نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ یہ نظریات ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ مسلمانوں نے اپنے تحفظ کے لیے سیکولرزم کا سہارا لیا ہے، اس لیے اگر مسلمانوں کے مسائل موضوعِ گفتگو ہوں تو وہ غیر مسلموں سے ساری گفتگو اور ربط میں اسلام کا ذکر کہیں نہیں آنے دیتے اور نتیجتاً دعوتی کام سے قاصر ہیں۔

اب اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ بہ حیثیت ملت دعوتِ الی اللہ کا کام کریں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے تحفظ کے لیے بھی اسلام ہی کو بنیاد بنائیں۔ اسلام اُن کے تحفظ کے لیے واضح بنیاد فراہم کرتا ہے۔ مسلمان اسلام کے حوالے سے بتا سکتے ہیں اور اپنے مخالفین کو

مطمئن کر سکتے ہیں کہ ہمیں اپنے جداگانہ دینی تشخص پر کیوں اصرار ہے؟ جب کہ سیکولرزم کے حوالے سے جداگانہ دینی تشخص کا جواز ثابت کرنا پیچیدگی کا باعث ہوتا ہے۔

چنانچہ مناسب یہ ہے کہ غیر مسلموں سے ربط و گفتگو میں سیکولرزم کی اصطلاح اور ملتی جلتی اصطلاحات کے استعمال سے گریز کیا جائے۔ ساری گفتگو اسلام کے حوالے سے ہو۔ انسانوں کو بتایا جائے کہ اسلام کیا ہے؟ کائنات کیا ہے؟ خدا اور انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ پھر یہ حقیقت واضح کی جائے کہ عقیدہ اور تصورات ہی عمل کی بنیاد بنتے ہیں، اس لیے سب سے پہلے عقائد اور تصورات کا مطابق حق ہونا ضروری ہے۔ اسلام کے عقائد اور تصورات حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ بات واضح کرنی چاہیے کہ عقیدے اور تصورات کے اشتراک کی بنا پر انسانوں کا اشتراک عمل بالکل فطری اور معقول ہے اور یہی مسلمانوں کے اجتماعی وجود (تشخص) کا جواز ہے۔

اگر مسلمان غیر مسلموں سے ربط و گفتگو کے وقت اسلام کو بنیاد بنائیں اور اسلام کے حوالے سے گفتگو کریں تو کا تحفظ اور کارِ دعوت ایک ہی کام کے دو بوج بن جائیں گے۔ غیر مسلموں سے ربط قائم کر کے اور گفتگو کر کے وہ مختلف معاملات میں اختیار کیے گئے اپنے موقف کی معقولیت بھی واضح کر رہے ہوں گے اور انسانوں کو دین حق کی طرف دعوت بھی دی رہے ہوں گے۔ اس طرح دعوت کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔ ان کا اجتماعی طرزِ عمل، اندازِ گفتگو، اجتماعی موقف کا اظہار اور اس کے حق میں استدلال یہ سب 'دعوت' بن جائے گا۔ ملک کا ماحول اس دعوتِ حق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

انسانی آزادی کا تحفظ

آزادی کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ دوسروں کی مرضی اُس پر نہ چلے، بلکہ وہ اپنے رجحانِ طبع کے مطابق کام کرنے اور زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو۔ یہ طلب اتنی شدید ہوتی ہے کہ بسا اوقات انسان آزاد ہونے یا آزاد رہنے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد عملاً آزادی سے محروم رہتی ہے۔ اس صورتِ حال کی دو بڑی وجوہ ہیں: ایک وجہ انسانوں کے درمیان ایسے افراد کی موجودگی ہے جو دوسروں پر اپنی مرضی چلانا چاہتے ہیں اور طاقت، تحریص یا فریب کے ذریعے اُن کی آزادی سلب کر لیتے ہیں۔ ایسے افراد کو یہ گوارا نہیں ہوتا کہ دوسرے انسان اُن کے مساوی ہو جائیں، بلکہ وہ اُن کے سر اپنے آگے جھکانا چاہتے ہیں۔ انسانوں کی آزادی سے محرومی کی ایک دوسری وجہ بھی ہے، جس کا تعلق انسانی زندگی کے اجتماعی پہلو سے ہے۔ ہر انسان اپنا انفرادی وجود یقیناً رکھتا ہے، لیکن زندگی بہ ہر حال وہ تنہا نہیں گزارتا، بلکہ اس کی فطرت اور ضروریات دونوں اسے مجبور کرتی ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی گزارے اور اجتماعی اداروں سے تعلق رکھے۔ ہوتا یہ ہے کہ بسا اوقات یہ اجتماعی ادارے انسان کی آزادی سلب کر لیتے ہیں اور اسے حریتِ فکر و عمل سے محروم کر دیتے ہیں۔

اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، انسانی آزادی کے حصول کے لیے درج ذیل نکات پر

غور ضروری ہے:

- (الف) انسانوں کی آزادی سلب کرنے والے متکبرین کے رویے کی اصلاح۔
 (ب) اگر اصلاح نہ ہو سکے تو متکبرین کے مقابلے میں آزادی کے تحفظ کی تدابیر۔
 (ج) اجتماعی اداروں کے طرزِ عمل کی اصلاح۔
 (د) اجتماعی اداروں کی زیادتیوں کا مقابلہ۔

انسانی آزادی کا مفہوم

مندرجہ بالا نکات سے قبل خود انسانی آزادی کے مفہوم پر غور کرنا چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک بنیادی سوال اٹھتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ایک شخص دوسرے انسانوں کی مرضی پر چلنے کے لیے تو مجبور نہ ہو، لیکن خود اپنی خواہشات کا بندہ بن جائے اور اپنے نفس کے ہر جائز و ناجائز مطالبے کو پورا کرنے لگے تو کیا واقعتاً ایسے فرد کو آزاد کہا جائے گا؟ اس امکان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو حقیقی آزادی اپنی فطرت سے ہم آہنگی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ انسان کی فطرت اصلاً خیر پسند ہے، چنانچہ جب انسان شر کو چھوڑ کر خیر کو اختیار کرتا ہے تو اس سچی آزادی سے ہم کنار ہوتا ہے، جس کی بے پناہ طلب انسانی سرشت میں پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ خیر کو چھوڑ کر شر کو اختیار کر لیتا ہے تو آزادی سے محروم ہو کر اپنے نفس یا شیطان کا غلام بن جاتا ہے۔ مطلق آزادی کے لغوی معنی تو یہ بیان کیے جاسکتے ہیں کہ انسان جو چاہے، کرے، لیکن انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خیر ہی کو چاہے، اسی کو طلب کرے اور شر کی طرف اپنے کو راغب نہ ہونے دے۔ اس نوعیت کی آزادی کے حصول کے لیے محض اُن بیرونی عناصر سے کش مکش کافی نہیں ہے، جو انسانوں کی آزادی کو سلب کرتے ہیں، بلکہ اس نفسِ امارہ سے کش مکش بھی ضروری ہے جو انسان کو برائی کی ترغیب دیتا ہے اور نیکی کرنے کی صلاحیت سے اسے محروم کر دیتا ہے:

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَهْوَاءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَمَنْ يَهْدِي مَنْ أَضَلَّ

اللَّهُ ۖ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ ۝ فَلَقَمُوا وُجُوهَهُمْ لِلدِّينِ حَنِيفًا فِطْرَتِ

اللَّهُ الَّذِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهِمْ لَا تَبْدِيلَ لِحُكْمِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ
الْقَيِّمُ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۝ (الرّوم: ۲۹-۳۰)

”مگر یہ ظالم بے سمجھہ بوجھ، اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے، جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو؟ ایسے لوگوں کا تو کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ پس ایک سو ہو کر اپنا رخ، اس دین کی سمت جمادو، قائم ہو جاؤ اس فطرت پر جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی ساخت بدلی نہیں جاسکتی۔ یہی بالکل راست اور درست دین ہے، مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔“

اس آیت کی روشنی میں آزادی کا مفہوم ہے ’انسان کا راہِ خیر اختیار کرنے پر قادر ہونا‘ یعنی جب نیکی اور بھلائی کے راستے کی رکاوٹیں دور ہو جائیں (چاہے وہ رکاوٹیں بیرونی طاقتوں نے ڈالی ہوں یا خود انسان کے نفس نے کھڑی کی ہوں) تو انسان کو آزادی حاصل ہوتی ہے۔ انسانی ارتقاء آزادی سے وابستہ ہے۔ انسان آزاد ہو تو اس کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں، اس کی شخصیت ابھرتی ہے اور تکمیلِ ذات کی طرف سفر اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے:

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۖ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۖ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ
زَكَّاهَا ۖ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۖ (الشمس: ۷-۱۰)

”نفسِ انسانی کی اور اس ذات کی قسم جس نے اسے ہموار کیا، پھر اس کی بدی اور اس کی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس دبا دیا۔“

اقبال نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے: —

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

متکبرین کا رویہ

انسانی فطرت خیر پسند بھی ہے اور حقیقت پسند بھی۔ اس کی خیر پسندی کا تقاضا ہے کہ وہ نیکی کے راستے کو اختیار کرے۔ اسی طرح اس کی حقیقت پسندی اس کو آمادہ کرتی ہے کہ معبود حقیقی کے آگے اپنا سر جھکائے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی کا فطری جذبہ، جو قلبِ انسانی میں پایا جاتا ہے، وہ مخلوقات کی بندگی سے آزادی کا جذبہ ہے، اس لیے کہ حقیقت کے اعتبار سے اس کائنات میں اقتدار صرف اللہ تعالیٰ کا ہے، مخلوقات کو کوئی اقتدار حاصل نہیں ہے۔ اس لیے یہ عین حقیقت پسندی ہے کہ انسان خالقِ حقیقی کے آگے سر جھکائے اور مخلوقات کے آگے اس کا سر نہ جھکے۔ متکبرین کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسانوں کو اللہ کی بندگی سے باز رکھیں۔ اس رویے کے مقابلے کے لیے بنیادی حقیقتوں کی یاد دہانی ضروری ہے:

أَرَأَيْتَ الَّذِي يَنْهَى ④ عَبْدًا إِذَا صَلَّى ⑤ أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ عَلَى
الْهُدَى ⑥ أَوْ أَمَرَ بِالتَّقْوَى ⑦
(الحلق: ۹-۱۲)

”تم نے دیکھا اس شخص کو جو ایک بندے کو منع کرتا ہے، جب کہ وہ نماز پڑھتا ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے اگر (وہ بندہ) راہِ راست پر ہو یا پرہیزگاری کی تلقین کرتا ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر یہ (منع کرنے والا شخص، حق کو) جھٹلاتا اور منہ موڑتا ہو۔“

یہاں خطاب عام انسانوں سے ہے جو متکبر شخص اور اللہ کے مخلص بندوں کے درمیان جاری کش مکش کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان مشاہدین کے ضمیر کو بھجھوڑا گیا ہے اور بالواسطہ طور پر خود متکبرین کو بھی حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، تاکہ اگر ان کی خوابیدہ فطرت کے اندر کچھ حق پسندی چھپی ہوئی ہو تو وہ اس توجہ دہانی سے فائدہ اٹھائیں اور جبر و اکراہ کے رویے سے باز آجائیں۔ البتہ اگر محض تلقین سے متکبرین کے رویے کی اصلاح نہیں ہوتی تو ان کو خدا کی پکڑ سے ڈرایا جانا چاہیے۔ خدا کی یہ گرفت آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ہو سکتی ہے:

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَبْزِي ⑧ كَلًّا لِّئِنْ لَّمْ يَنْتَهُوا ⑨ لَنَنْصِفَنَّ

بِالنَّاصِيَةِ ۝ النَّاصِيَةُ كَاذِبَةٌ خَاطِئَةٌ ۝ فَلْيَدْعُ نَادِيَهُ ۝ سَنَدْعُ
الزَّبَانِيَةَ ۝ (العلق: ۱۴-۱۸)

”کیا وہ نہیں جانتا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اگر وہ باز نہ آیا تو ہم اس کی پیشانی
کے بال پکڑ کر کھینچیں گے، اس پیشانی کے جو جھوٹی اور سخت خطا کا رہے۔ وہ بلا لے
اپنے، حامیوں کی ٹولی کو، ہم بھی عذاب کے فرشتوں کو بلا لیں گے۔“

جبر و اکراہ متکبرین کا ایک حربہ ہے، جن کے ذریعے وہ انسانوں کو اللہ کی بندگی سے
روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا دوسرا حربہ فریب ہے۔ اس فریب سے انسان بچ سکتا ہے، اگر
وہ سہل انگاری اور نفسانیت کی روش اختیار کرنے کے بجائے عقل و ہوش سے کام لے۔ بہ ہر صورت
اس فریب کی حقیقت آخرت میں کھل کر سامنے آجائے گی:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُؤْمِنَ بِهِذَا الْقُرْآنَ وَلَا بِالَّذِي بَيْنَ
يَدَيْهِ ۖ وَلَوْ تَرَىٰ إِذِ الظَّالِمُونَ مَوْقُوفُونَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ يَرْجِعُ
بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ ۖ يَقُولُ الَّذِينَ الَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا لِلَّذِينَ
اسْتَكْبَرُوا أَوْلَا أَنْتُمْ لَكُنَّا مُؤْمِنِينَ ۝ قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا
لِلَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا أَنْحَنُ صَدَدُكُمْ عَنِ الْهُدَىٰ بَعْدَ إِذْ جَاءَكُمْ ۖ
بَلْ كُنْتُمْ مُجْرِمِينَ ۝ وَقَالَ الَّذِينَ اسْتَضَعُّوْا لِلَّذِينَ
اسْتَكْبَرُوا بَلْ مَكْرُ الْبَيْلِ وَالنَّهَارِ إِذْ تَأْمُرُونَنَا أَنْ نَكْفُرَ بِاللَّهِ
وَنَجْعَلَ لَهُ أَندَادًا ۖ وَأَسْرُوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَأَوْا الْعَذَابَ ۖ وَجَعَلْنَا
الْأَغْلَلَ فِي آعْنَاقِ الَّذِينَ كَفَرُوا ۖ هَلْ يُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كَانُوا
يَعْمَلُونَ ۝ (سبا: ۳۱-۳۳)

”یہ کافر کہتے ہیں کہ ”ہم ہرگز اس قرآن کو نہ مانیں گے اور نہ اس سے پہلے آئی ہوئی
کسی کتاب کو تسلیم کریں گے۔ کاش تم دیکھو ان کا حال اُس وقت جب یہ ظالم اپنے
رب کے حضور کھڑے ہوں گے۔ اُس وقت یہ ایک دوسرے پر الزام دھریں گے۔“

جو لوگ دنیا میں دبا کر رکھے گئے تھے وہ بڑے بننے والوں سے کہیں گے کہ ”اگر تم نہ ہو تے تو ہم مومن ہوتے۔“ وہ بڑے بننے والے ان دبے ہوئے لوگوں کو جواب دیں گے: ”کیا ہم نے تمہیں اُس ہدایت سے روکا تھا جو تمہارے پاس آئی تھی؟ نہیں، بلکہ تم خود مجرم تھے۔“ وہ دبے ہوئے لوگ ان بڑے بننے والوں سے کہیں گے: ”نہیں، بلکہ شب و روز کی مکاری تھی، جب تم، ہم سے کہتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کریں اور دوسروں کو اُس کا ہم سر ٹھیرائیں۔“ آخر کار جب یہ لوگ عذاب دیکھیں گے تو اپنے دلوں میں پچھتاہیں گے اور ہم ان منکرین کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ کیا لوگوں کو اس کے سوا کوئی بدلہ دیا جاسکتا ہے کہ جیسے اعمال اُن کے تھے، ویسی ہی جزا پائیں؟“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”عوام الناس، آج دنیا میں اپنے لیڈروں، سرداروں، پیروں اور حاکموں کے پیچھے آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں، اور اُن کے خلاف کسی ناصح کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہیں (مگر) یہی عوام جب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ حقیقت کیا تھی اور اُن کے پیشوا، انہیں کیا باور کر رہے تھے، اور جب انہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ ان رہنماؤں کی پیروی انہیں کس انجام سے دوچار کرنے والی ہے، تو یہ اپنے بزرگوں پر پلٹ پڑیں گے اور چیخ چیخ کر کہیں گے کہ کم بختو، تم نے ہمیں گمراہ کیا۔ تم ہماری ساری مصیبتوں کے ذمہ دار ہو، تم ہمیں نہ بہکا تے تو ہم خدا کے رسولوں کی بات مان لیتے۔“

(تفہیم القرآن، سورہ سبا، حاشیہ ۵۱)

دوسری جانب بڑے بننے والے، منکرینِ حق سے اپنی برأت کا اظہار کریں گے یعنی اپنی جانب سے کسی جبر و اکراہ کی نفی کریں گے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

”وہ (بڑے بننے والے) کہیں گے کہ ”ہمارے پاس ایسی کوئی طاقت نہ تھی جس سے ہم چند انسان تم کروڑوں انسانوں کو زبردستی اپنی پیروی پر مجبور کر دیتے۔ اگر تم ایمان

لانا چاہتے تو ہماری سرداریوں اور پیشوائیوں کا تختہ الٹ سکتے تھے۔ ہماری فوج تو تم ہی تھے، ہماری دولت اور طاقت کا سرچشمہ تو تمہارے ہی ہاتھ میں تھا۔ تم نہ رانے نہ دیتے تو ہم مفلس تھے، تم ہمارے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے تو ہماری پیری ایک دن نہ چلتی۔ تم زندہ باد کے نعرے نہ مارتے تو کوئی ہمارا پوچھنے والا نہ ہوتا۔ اب کیوں نہیں ماننے کہ دراصل تم خود اس راستے پر نہ چلنا چاہتے تھے جو رسولوں نے تمہارے سامنے پیش کیا تھا۔ تم اپنی اغراض و خواہشات کے بندے تھے اور تمہارے نفس کی یہ مانگ رسولوں کی بتائی ہوئی راہ تقویٰ کے بجائے ہمارے ہاں پوری ہوتی تھی۔

تم حرام و حلال سے بے نیاز ہو کر عیش دنیا کے طالب تھے اور وہ ہمارے پاس ہی تمہیں نظر آتا تھا۔ تم ایسے پیروں کی تلاش میں تھے جو تمہیں ہر طرح کے گناہوں کی کھلی چھوٹ دیں اور کچھ نہ رانے لے کر خدا کے ہاں تمہیں بخشوا دینے کی خود ذمہ داری لے لیں۔ تم ایسے پنڈتوں اور مولویوں کے طلب گار تھے جو ہر شرک اور ہر بدعت اور تمہارے نفس کی ہر دل پسند چیز کو عین حق ثابت کر کے تمہارا دل خوش کریں اور اپنا کام بنائیں۔ تم کو ایسے جعل سازوں کی ضرورت تھی جو خدا کے دین کو بدل کر تمہارے خواہشات کے مطابق ایک نیا دین گھڑیں۔ تم کو ایسے لیڈر درکار تھے جو کسی نہ کسی طرح تمہاری دنیا بنادیں، خواہ عاقبت بگڑے یا درست ہو۔ تم کو ایسے حاکم مطلوب تھے جو خود بد کردار اور بد دیانت ہوں اور ان کی سرپرستی میں تمہیں ہر قسم کے گناہوں اور بد کرداریوں کی چھوٹ ملی رہے۔ اس طرح ہمارے اور تمہارے درمیان برابر کے لین دین کا سودا ہوا تھا۔ اب تم کہاں یہ ڈھونگ رچانے چلے ہو کہ گویا تم بڑے معصوم لوگ تھے اور ہم نے زبردستی تم کو بگاڑ دیا تھا۔“ (ایضاً، حاشیہ ۵۲)

عوام اور بڑے بننے والوں کے اس مباحثے پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہکانے والوں کے مکر و فریب سے بچنے کے لیے عقل و ہوش کا استعمال اور آخرت کی باز پرس کا استحضار ضروری ہے۔ انسان کو خواہشات کی پیروی کے بجائے دین حق کو

اختیار کرنا چاہیے، خواہ حق کا راستہ دشواریوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہو۔ اسی طرح متکبرین کے جبر و اکراہ کے مقابلے کے لیے اُن کو یاد دلایا جانا چاہیے کہ خدا کی بندگی اور راہِ راست کی پیروی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ اگر متکبرین انسانوں کو جبر و اکراہ کے ذریعے اللہ کی بندگی سے روکیں گے تو دنیا اور آخرت میں اللہ کی گرفت کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

متکبرین کی طرح اجتماعی اداروں کی جانب سے بھی انسانی آزادی کو سلب کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ اس موضوع پر گفتگو ان شاء اللہ کسی اور موقع پر کی جائے گی۔

کثرتیت اور اقامتِ دین

کثرتیت (Pluralism) آج کا ایک مقبول نعرہ ہے۔ چنانچہ اکثر کہا جاتا ہے کہ حکومتوں کا رویہ کثرتیت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ کثرتیت سے ہم آہنگی کی یہی توقع سیاسی و سماجی تحریکوں سے بھی کی جاتی ہے۔ کثرتیت کے نعرے سے متاثر موجودہ فضا میں کارِ اقامتِ دین کی معنویت بھی زیرِ بحث آگئی ہے۔ مسلمانوں کے حلقوں میں یہ سوالات اٹھنے لگے ہیں کہ کثرتیت سے معمور فضا میں اقامتِ دین کے نصب العین کا اختیار کیا جانا موزوں و مناسب بھی ہے یا نہیں؟ اگر اس نصب العین کا اختیار کرنا موزوں سمجھا جائے تو مزید سوال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اقامتِ دین کی تشریح کیا ہے اور اُس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس طرح کے خیالات کی موجودگی کی بنا پر ضرورت ہے کہ کثرتیت سے متعلق بحث کا سنجیدہ نوٹس لیا جائے، جو ہمارے ملک میں بھی ہو رہی ہے اور ملک کے باہر بھی۔ موضوع کے بنیادی سوالات پر غور سے پہلے خود کثرتیت کی اصطلاح کے بعض پہلوؤں پر توجہ ضروری معلوم ہوتی ہے۔

کثرتیت کی اصطلاح

اس اصطلاح سے متعلق چند اہم پہلو یہ ہیں:

- (الف) اجتماعی حلقوں میں زیرِ بحث بعض اصطلاحیں محض کسی موضوع یا نقطہ نظر کا تعارف کراتی ہیں، مثلاً معاشیات کے مباحث میں 'انفرادی ملکیت' کی اصطلاح پر غور کیجئے۔ اس اصطلاح کا مفہوم محض اتنا ہے کہ اشیاء پر افراد کے حقِ ملکیت کو تسلیم کیا جائے۔

الفاظ کی اس ترکیب میں بہ طور خود توصیف یا ذم کا کوئی پہلو شامل نہیں ہے۔ انفرادی ملکیت کے قائلین اور ناقدین دونوں اپنے اپنے نقطہ نظر کے اظہار کے لیے اس اصطلاح کا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس بعض اصطلاحیں محض کسی نقطہ نظر کا تعارف نہیں کراتیں، بلکہ اپنے اندر توصیف یا ذم کا مفہوم بھی رکھتی ہیں۔ کثرتیت یا Pluralism کے الفاظ اسی نوعیت کے ہیں۔ کثرتیت کے معنی محض ایک خاص رویے یا نقطہ نظر کے نہیں ہیں، بلکہ اس رویے کے مطلوب اور پسندیدہ ہونے کا مفہوم بھی اس اصطلاح میں شامل ہے۔ چنانچہ اس قسم کے الفاظ محض اصطلاح نہیں ہوتے، بلکہ نعرے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ مجرد اصطلاحیں تو محض علمی تجربے کا موضوع ہوتی ہیں، مگر نعرے جذبات کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کی اثر انگیزی زیادہ ہوتی ہے۔ اسی اعتبار سے ان کی درست تفہیم کے لیے نسبتاً زیادہ ہوش مندی اور باریک بینی درکار ہوتی ہے۔

(ب) جب کوئی اصطلاح قبولیت عام حاصل کر کے نعرہ بن چکی ہو تو یہ سوال کم ہی لوگ کرتے ہیں کہ یہ نعرہ معقول بھی ہے یا نہیں؟ غیر شعوری طور پر مقبولیت کو معقولیت کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ جب دنیا میں کوئی طرز فکر چل پڑے تو عموماً اُس پر تنقیدی نظر ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ کثرتیت کے نعرے کے سلسلے میں کیفیت یہی ہے۔ یہ اصطلاح مغرب کی سیاسی و فکری فضا کی دین ہے اور مغربی میڈیا نے اس کو دنیا میں رائج کیا ہے۔ مغرب کے سیاسی غلبے کی بنا پر اور مغربی میڈیا کے پروپگنڈے کے زیر اثر دنیا کے مرعوب دماغوں نے تحقیق و تجزیے کی زحمت گوارا کیے بغیر اس نعرے کو قبول کر لیا ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ کسی طرز فکر یا نعرے کے سلسلے میں یہ رویہ معقول نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نعرے کا مفہوم متعین کیا جائے، اس کے مضمرات پر غور کیا جائے اور اُس کے حق میں پیش کیے جانے والے استدلال کا علمی جائزہ لیا جائے۔ علمی معیارات پر پورا اترنے والا طرز فکر ہی سنجیدہ توجہ کا مستحق ہو سکتا

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

ہے۔ کسی نقطہ نظر کی صداقت جانچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ذہن کو موعوبیت سے آزاد رکھا جائے۔ یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ جس نعرے کو میڈیا کی تائید حاصل ہو وہ لازماً درست ہوتا ہے۔

(ج)

کثرتیت کی اصطلاح عرصے سے موجود ہے، لیکن پچھلی چند دہائیوں سے اس کا چرچا زیادہ ہونے لگا ہے۔ اسی دوران علمی و سیاسی مباحث میں جدیدیت (Modernity) اور مابعد جدیدیت (Post modernity) نامی دو متضاد رویوں کا تذکرہ شروع ہوا۔ جدیدیت کے تجربے سے غیر مطمئن ذہن اُس انتشارِ فکر (Anarchy) کی طرف راغب ہونے لگے، جس کی نمائندگی مابعد جدیدیت کا رجحان کرتا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے درمیان کش مکش کے باوجود جہاں تک کثرتیت کے نعرے کا تعلق ہے، دونوں رجحانات کے علم بردار اس نعرے کی تائید کرتے نظر آتے ہیں، گو اُن کی تائید کے محرکات مختلف ہیں۔ جدیدیت کے قائلین عموماً سیکولرزم — مذہب و ریاست کی علیحدگی — کو درست سیاسی پالیسی قرار دیتے ہیں۔ اگر سیکولرزم کی مندرجہ بالا تشریح میں مذہب کی نفی شامل نہ کی جائے تو اس میں اور کثرتیت کے نعرے میں زیادہ فاصلہ نہیں رہتا۔ دوسری جانب مابعد جدیدیت کے علم بردار سرے سے منظم فکر ہی کی نفی کرتے ہیں، چنانچہ اُن کو کثرتیت کا نعرہ اپیل کرتا ہے۔

(د)

کثرتیت کے نعرے کے سلسلے میں یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ عملاً اس کے مضمرات نیشن اسٹیٹ (قوم پرستی پر مبنی ریاست) کے سیاق میں سامنے آتے ہیں۔ یوں تو ہر حکومت ایک متعین خطے پر قائم ہوتی ہے اور اس کی جغرافیائی حدود اس کے حدودِ اقتدار کی نشان دہی کرتی ہیں، لیکن نیشن اسٹیٹ عموماً محض سیاسی وحدت پر قناعت نہیں کرتی، بلکہ اُس مخصوص خطے ارضی کی ثقافتی شناخت (Cultural Identity) کی بھی قائل ہوتی ہے۔ یہ ثقافتی شناخت چونکہ کسی متفق علیہ تصور سے عبارت نہیں ہوتی، اس لیے اُس کی تعبیر و تشریح میں اُس حکومت کے تحت رہنے والے مختلف افراد اور

گروہوں میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ تاریخی اسباب کی بنا پر جس گروہ کو اقتدار مل گیا ہوتا ہے وہ اپنی مخصوص تعبیر کو سارے باشندگانِ مملکت پر بہ جبر مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فطری طور پر اقتدار سے محروم گروہ یا کم طاقت رکھنے والے عناصر اس جبر کی مزاحمت کرتے ہیں۔ اس کش مکش سے بچنے یا اُس کی شدت کم کرنے کے لیے کثرتیت کے نعرے کا سہارا لیا جاتا ہے۔ گویا یہ نعرہ اصلاً عملی مسائل کے حل کے لیے وضع کیا گیا ہے، نہ کہ سماجی حقائق کے تجزیے و تفہیم کے لیے۔

کثرتیت کا مفہوم

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں اور انسانی گروہوں کے درمیان گونا گوں نوعیتوں کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ تنوع (Diversity) ایک حقیقت ہے، جس کا انکار کرنا کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ کثرتیت کی اصطلاح کبھی کبھی اس واقعے کے بیان کے لیے استعمال کی جاتی ہے، مثلاً جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ ہندوستان کا سماج Plural (یعنی کثرتیت کا حامل) ہے تو وہ اس واقعے کا ذکر کرتا ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے رنگ و نسل، علاقہ و زبان اور عقیدہ و مذہب وغیرہ کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان سب پہلوؤں سے ان کے درمیان نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ اس تنوع کو بطور واقعہ ہر شخص تسلیم کرے گا، جو حقائق کا انکار نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کثرتیت کی اصطلاح محض ایک حقیقی صورت حال کی عکاسی کے لیے استعمال کی جائے (جو فی الواقع موجود ہے) تو اس اصطلاح پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ 'عرب کا بیش تر حصہ ریگستان ہے' اور اُس کا یہ قول محض ایک حقیقت کا اظہار ہے تو وہ اسی طرح یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ فلاں ملک کا سماج Plural (کثرتیت کا حامل) ہے اور یہ بھی محض ایک حقیقت کا اظہار ہوگا۔

لیکن کثرتیت (Pluralism) کی اصطلاح عموماً محض ایک واقعے کے بیان کے

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

لیے استعمال نہیں ہوتی بلکہ اُس رویے کے لیے استعمال ہوتی ہے جو انسانی سماج میں موجود تنوع کے سلسلے میں اختیار کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ کثرتیت، محض واقعتاً موجود تنوع اور اختلاف کے ادراک و اعتراف کا نام نہیں ہے، بلکہ اس سوال کے جواب کا نام ہے کہ اس اختلاف کے تقاضے کیا ہیں؟ اور اس تنوع کی موجودگی میں مناسب رویہ کیا ہونا چاہیے جسے اختیار کیا جائے؟ اس مفہوم میں کثرتیت کا لفظ محض ایک اصطلاح نہیں رہتا، بلکہ نعرہ بن جاتا ہے، جو مطلوب رویے کی نشان دہی کرتا ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں Pluralism کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

"A form of society in which the members of minority groups maintain their independent cultural traditions"

(ایسا معاشرہ جہاں اقلیتوں کو اپنی تہذیبی روایات کے تحفظ و بقا کی ضمانت حاصل ہو)

ریفرنس آکسفورڈ ڈکشنری میں Pluralism کا مفہوم بتاتے ہوئے کہا گیا ہے:

"The existence or toleration in society of a number of groups that belong to different races or have different political or religious beliefs"

(کسی معاشرے میں مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والے یا مختلف سیاسی و مذہبی تصورات

کے حامل گروہوں کی موجودگی اور ان کے تئیں رواداری)

مندرجہ بالا دونوں تعریفوں میں کثرتیت کی تشریح ایک رویے کے طور پر کی گئی ہے، نہ

کہ محض ایک واقعے کے طور پر۔

برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا میں Pluralism کی تشریح اس طرح ہے:

"In political science, the view that in liberal democracies, power should be dispersed among a variety of economic and ideological pressure groups and should not be held by a single elite or group of elites. Pluralism assumes that diversity is beneficial to society and that the disparate functional or cultural

groups of which society is composed including religious groups, trade unions, professional organizations and ethnic minorities—should be autonomous."

(کثرتیت، علم سیاست کی ایک اصطلاح ہے۔ یہ اس تصور سے عبارت ہے کہ آزاد خیال (لبرل) جمہوری ریاستوں میں اقتدار پر ایک طبقے یا چند طبقات کا قبضہ نہیں ہونا چاہئے، بلکہ اقتدار مختلف معاشی طبقات اور نظریاتی گروہوں کے درمیان منقسم ہونا چاہیے۔ کثرتیت کا بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ تنوع معاشرے کے لیے مفید ہے۔ چنانچہ معاشرے کے مختلف طبقات اور تہذیبی اکائیوں کو—جن میں مذہبی گروہ ٹریڈ یونین، پیشہ ورانہ انجمنیں اور نسلی گروہ شامل ہیں—حق خود اختیاری حاصل ہونا چاہئے۔)

مندرجہ بالا اثریجات سے معلوم ہوتا ہے کہ کثرتیت کے مفہوم میں درج ذیل عناصر

شامل ہیں:

(الف) رواداری (ب) اقلیتوں کی تہذیبی روایات کا تحفظ (ج) تہذیبی اکائیوں کا حق خود اختیاری (autonomy) (د) سیاسی اقتدار کا ایک گروہ میں مرتکز نہ ہونا (ه) تنوع کو پسندیدہ قرار دینا۔

اب مندرجہ بالا نکات کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کی تفہیم سے پہلے کارِ اقامت دین کا تذکرہ ضروری ہے۔

اقامت دین

کثرتیت کے نقطہ نظر کا جو جائزہ پیش نظر ہے، وہ کارِ اقامت دین کے سیاق میں ہے۔ چنانچہ مناسب ہوگا کہ دین کی اقامت کا مفہوم ذہنوں میں تازہ کر لیا جائے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ
وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَى وَعِيسَى أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا

تَتَفَرَّقُوا فِيهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ إِلَيْهِ اللَّهُ يَجْتَبِي
إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَى آلِيهِ مَنْ يَشَاءُ ۝ (الشوریٰ: ۱۳)

”اُس اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اُس نے نوح کو دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کی تاکید ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کی تھی کہ قائم کرو اس دین کو اور اس سلسلے میں آپس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ جس بات کی طرف تم بلاتے ہو وہ مشرکوں پر سخت گراں ہے۔ اللہ چُن لیتا ہے اپنی طرف سے جس کو چاہے اور اپنی طرف آنے کا راستہ اُس کو دکھاتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرے۔“

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے رسول حضرت نوح علیہ السلام ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ فی الحقیقت تشریع احکام کا سلسلہ ان ہی سے شروع ہوا اور آخری نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن پر سلسلہ رسالت و نبوت منتہی ہوا۔ درمیان میں جو انبیاء و رسل آئے، اُن میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام، یہ تین زیادہ مشہور ہوئے، جن کے نام لیوا ہر زمانے میں بہ کثرت موجود رہا کیے۔ ان پانچوں کو اولوالعزم پیغمبر کہتے ہیں۔ بہ ہر حال اس جگہ حق تعالیٰ نے صاف طور پر بتلادیا کہ اصل دین ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے، کیوں کہ عقائد، اخلاق اور اصولِ دیانات میں تمام متفق رہے ہیں، البتہ بعض فروع میں حسب مصلحتِ زمانہ کچھ تفاوت ہوا... (چنانچہ) سب انبیاء اور اُن کی امتوں کو حکم ہوا کہ دین الہی کو اپنے قول و عمل سے قائم رکھیں۔“

دستورِ جماعتِ اسلامی ہند میں اقامتِ دین کی اصطلاح کی جامع تشریح درج کی گئی ہے:

”اقامتِ دین میں لفظ دین سے مراد وہ دین حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام

انبیاءؑ کے ذریعے مختلف زمانوں اور ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اُس کی زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الہی اور فلاحِ آخرت کا ضامن ہے، اسی طرح دنیوی مسائل کے حل کے لیے بہترین نظامِ زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح و ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔

اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء، معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔“ (دستور جماعت اسلامی ہند، دفعہ ۴)

رواداری

رواداری اُن عناصر ترکیبی میں سے ایک ہے جو کثرتیت کے تصور کی تشکیل کرتے ہیں۔ رواداری کے معنی یہ ہیں: ”اپنے نظریے و مسلک کو حق سمجھتے ہوئے، اس سے اختلاف رکھنے والوں کی یہ آزادی تسلیم کرنا کہ وہ جس نظریے و مسلک کو چاہیں اختیار کر سکیں۔“ یہ رواداری کے تصور کی مثبت تشریح ہے۔ منفی پہلو سے رواداری کا مفہوم یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ ”اپنے نظریے

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

و مسلک کے حق ہونے پر پختہ یقین کے باوجود کسی سے اُس کو بالجبر منوانے کی کوشش نہ کرنا۔
رواداری کے اس مثبت و منفی مفہوم کی اسلام تائید کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ
بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمَرْ بِاللَّهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ ۚ لَا
انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (البقرة: ۲۵۶)

”کوئی زبردستی نہیں دین کے معاملے میں۔ بے شک ہدایت گم راہی سے ممتاز ہو چکی
ہے۔ جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط سہارا
تھام لیا جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔“

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

”جب دلائل توحید بہ خوبی بیان فرما دیے گئے، جس سے کافر کو کوئی عذر باقی نہ رہا تو
اب زور (زبردستی) سے کسی کو مسلمان کرنے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے۔ عقل والوں کو
خود سمجھ لینا چاہیے۔ اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔“

دوسری جگہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ الْمَنَ فِي الْأَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيعًا ۚ أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ
النَّاسَ حَتَّىٰ يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝ (یونس: ۹۹)

”اور اگر تیرا رب چاہتا تو بے شک ایمان لے آتے وہ تمام لوگ جو زمین میں ہیں۔“

پھر کیا تم زبردستی کرو گے لوگوں پر حتیٰ کہ وہ مومن ہو جائیں!“

اس آیت کے ذیل میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

”آپ (ﷺ) کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اُتار دیں۔ خدا
چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دل میں ایمان ڈال سکتا تھا، مگر ایسا کرنا اُس کی

تکوینی حکمت و مصلحت کے خلاف تھا، اس لیے نہیں کیا۔“

فَذَكِّرْهُ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۚ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۖ (الأنعام: ۲۱-۲۲)
وَكَفَرُوا ۖ فَيُعَذِّبُهُ اللَّهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۚ

”پس آپ ان کو سمجھائیے۔ آپ کا کام یہی سمجھانا ہے۔ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں۔ چنانچہ جس نے حق سے روگردانی کی اور کفر کیا تو اللہ اُس کو بڑی سزا دے گا۔“

ان آیات کی تشریح یہ ہے:

”جب یہ لوگ باوجود دلائل واضحہ کے غور نہیں کرتے تو آپ بھی ان کی فکر میں زیادہ نہ پڑیے، بلکہ صرف نصیحت کر دیا کیجیے، کیونکہ آپ نصیحت کرنے اور سمجھانے ہی کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ اگر یہ نہیں سمجھتے تو کوئی آپ ان پر داروغہ بنا کر مسلط نہیں کیے گئے کہ زبردستی منوا کر چھوڑیں اور ان کے دلوں کو بدل ڈالیں۔ یہ کام مقلب القلوب کا ہے۔ (لیکن وہ اس لیے نہیں کرتا کہ زبردستی ہدایت، دل میں اتار دینا اُس کی تکوینی حکمت کے خلاف ہے۔)“

آیات بالا سے یہ بات واضح ہے کہ رواداری کے معنی حق کی تبلیغ سے باز آ جانے کے نہیں ہیں، بلکہ صرف یہ ہیں کہ حق تبلیغ ادا کرنے کے بعد داعی حق کو اس امر کی کوشش نہ کرنی چاہیے کہ منکرین کو زبردستی دائرۂ اسلام میں لے آیا جائے۔

تہذیبی آزادی

رواداری کا لفظ عموماً افراد پر جبر نہ کرنے کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ عقل کا تقاضا ہے کہ نظریہ و مسلک کی جو آزادی فرد کے لیے تسلیم کی جاتی ہے وہ گروہوں کے لیے بھی تسلیم کی جائے۔ ہر اُس گروہ کے سلسلے میں، جو اپنا کوئی دین رکھتا ہے اور کسی تہذیبی روایت (Cultural Tradition)

سے وابستہ ہے، اسلام اس اصول کا قائل ہے کہ اُسے اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اور اپنے تہذیبی تصورات کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ کثرتیت کا موجودہ نعرہ اسلام کے اس اصول کے قریب پہنچ گیا ہے، تاہم کثرتیت کے موجودہ تصور میں تین نمایاں خامیاں موجود ہیں:

(الف) تہذیبی اکائیوں کے اپنے تصورات کے مطابق اجتماعی زندگی گزارنے کے حق کو دنیا کے اکثر ممالک کے دستوروں میں صاف و صریح الفاظ میں تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً افراد کے حقوق پر توجہ کی گئی ہے، لیکن گروہوں کے حقوق کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دستور ہند کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کا دستور اقلیتوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کے حق کو اور پرسنل لا کی حد تک مذہبی تعلیمات پر عمل کرنے کے حق کو تسلیم کرتا ہے، لیکن دیگر اجتماعی معاملات کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا۔ پھر پرسنل لا پر عمل کا حق بھی مستقلاً دستور ہند کے رہنما اصولوں کی زد میں ہے جو یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی تلقین کرتے ہیں۔

(ب) دوسری بڑی خامی یہ ہے کہ اکثر دساتیر مملکت میں تہذیبی حقوق کا تذکرہ اقلیتوں کے سیاق میں ہے، جب کہ کسی گروہ کی آبادی کے کم یا زیادہ ہونے کا ان حقوق سے کوئی تعلق نہیں۔ معقولیت کا تقاضا یہ تھا کہ تہذیبی روایات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق تمام تہذیبی اکائیوں کے لیے تسلیم کیا جاتا۔ (بلا لحاظ اس کے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے یا کم)۔

(ج) تیسری خامی یہ ہے کہ تہذیبی اکائیوں کے بعض حقوق یقیناً کچھ جمہوری ریاستوں میں تسلیم کر لیے گئے ہیں، لیکن تہذیبی اکائیوں کو خود اختیاری (Autonomy) دینے کے لیے جمہوری ریاستیں تیار نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان ریاستوں کے کارفرما عناصر جارحانہ قوم پرستی سے متاثر ہیں۔ چنانچہ جس کلچر کو وہ 'قومی کلچر' سمجھتے ہیں اُس کو تمام باشندگان مملکت پر بہ جبر مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ اس

رجحان کی موجودگی میں یہ تجویز اُن کے لیے ناقابل تصور ہے کہ تہذیبی اکائیوں کو تہذیبی خود اختیاری حاصل ہو۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے تہذیبی اکائیوں کے سلسلے میں جس وسیع انظری کا ثبوت دیا ہے، کثرتیت کے موجود قائلین ابھی فکر و نظر کی اس بلندی تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ وہ اسلامی نظام سے استفادہ کریں۔

تنوع کی حیثیت

انسانی معاشرے میں جو تنوع پایا جاتا ہے اُس کو کثرتیت کے تصور کے مطابق پسندیدہ اور مطلوب سمجھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اسلامی نقطہ نظر کی تفہیم کے لیے تنوع کی دو قسموں میں فرق ضروری ہے۔ افراد کے مابین ایک فرق وہ ہوتا ہے جو رنگ و نسل یا زبان کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اسلام اس فرق کو اللہ کی نشانی قرار دیتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقُ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ
وَأَلْوَانِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ○
(الروم: ۲۲)

”اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں دانش مند لوگوں کے لیے۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”دنیا میں آپ ہر طرف اتنا تنوع (Variety) پائیں گے کہ اس کا احاطہ مشکل ہو جائے گا۔ انسان، حیوان، نباتات اور دوسری تمام اشیاء کی جس نوع کو بھی آپ لے لیں، اُس کے افراد میں بنیادی یکسانی کے باوجود بے شمار اختلافات موجود ہیں، حتیٰ کہ کسی نوع کا بھی کوئی ایک فرد دوسرے سے بالکل مشابہ نہیں ہے۔“

(تفہیم القرآن، سورہ روم، حاشیہ ۳۲)

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

رنگ، نسل، علاقہ اور زبان کے اشتراک کی بنیاد پر قبیلے اور شعوب وجود میں آتے ہیں۔ قرآن کے مطابق قبائل اور شعوب کا وجود، اللہ تعالیٰ کے منصوبے کے تحت ہوا ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتَقْوَاهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝ (الحجرات: ۱۳)

”اے انسانو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“

مولانا مودودیؒ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

”اس آیت میں پوری نوع انسانی کو خطاب کر کے اس عظیم گم راہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالم گیر فساد کی موجب بنی رہی ہے۔ مختصری آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں: ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہی ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں، وہ درحقیقت ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور باپ سے شروع ہوئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا، مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنا پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کم تر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں اور ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق بتائے۔ خالق نے

جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعاون اور تعارف کی فطری صورت یہی تھی۔ تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔“ (ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

رنگ، نسل، علاقہ و زبان کے فرق کے علاوہ انسانوں میں ایک دوسرا فرق بھی پایا جاتا ہے اور وہ دین کا فرق ہے۔ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق اس فرق کو گوارا تو کیا جائے گا، لیکن اس کو اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ نہیں قرار دیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر کو ناپسند اور شکر گزاری کو پسند کرتا ہے:

إِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ (الزمر: ۷)

”اگر تم کفر کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے۔ لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر تم شکر کو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔“

کثرتیت کے قائلین کی عظیم غلطی یہ ہے کہ وہ رنگ و نسل کے اختلاف اور دین کے اختلاف کو یکساں حیثیت دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اختلاف کی دونوں نوعیتیں انسانی معاشرے کے لیے مفید ہیں۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ دین حق سے وابستگی انسان کے لیے مفید اور ادا یا ن باطلہ کی پیروی اُس کے لیے تباہ کن ہے۔

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

کثرتیت کے اجزاء ترکیبی کے مندرجہ بالا تجزیے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تصور کثرتیت میں صحیح اور غلط دونوں طرح کے عناصر موجود ہیں۔ چنانچہ اس نعرے کو جوں کا توں قبول نہیں کیا جاسکتا۔ کثرتیت کے نعرے کو بے اعتدالیوں سے پاک کر کے تصور اسلام سے ہم آہنگ بنانے کی ضرورت ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ دین کی اقامت تمام اہل ایمان کا فریضہ ہے۔ کثرتیت کے حامل معاشروں میں رہنے والے اہل ایمان اس فریضے سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

سماجی تنوع اور اس کے تقاضے

آج کل مسلمانوں کی آپس کی گفتگو میں یہ بات اکثر سننے کو ملتی ہے: ”ہم ایک تکثیری سماج (Plural Society) میں رہتے ہیں۔ ہمیں اس کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔“ مسلمانوں کی آپس کی گفتگو کے علاوہ بعض غیر مسلم دانش مند بھی مسلمانوں کو یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ وہ تکثیری سماج کے تقاضوں کو سمجھیں اور اُن کا لحاظ رکھیں۔ چنانچہ یہ ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ”تکثیری سماج“ کی اس مقبول عام اصطلاح کے معنی متعین کیے جائیں۔

لغوی مفہوم

Illustrated آکسفورڈ ڈکشنری میں Pluralism کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے:

"A form of society in which the members of minority groups maintain their independent cultural traditions"

(ایسا سماج جس میں رہنے والے اقلیتی گروہ اپنی تہذیبی روایات پر قائم ہوں)

بہ حوالہ ۱۹۹۸ ایڈیشن/دہلی

آکسفورڈ ریفرنس ڈکشنری میں Pluralism کے تحت ذیل کا مفہوم درج کیا گیا

ہے:

"The existence or toleration in society of a number of groups that belong to different races or have different political or religious beliefs"

عصر حاضر کے پرفریب نعرے

(سماج میں ایسے گروہوں کی موجودگی یا ان کے تئیں رواداری جن کا تعلق مختلف نسلوں سے ہو یا جن کے مذہبی و سیاسی تصورات مختلف ہوں)“

بہ حوالہ ۲۰۰۱ ایڈیشن نیویارک

برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا میں Pluralism کے تحت ذیل کی عبارت درج ہے:

"...the view in liberal democracies that power should be shared and is not (or should not be) held by a single elite or groups of elites. Pluralism assumes diversity is beneficial to society and that the disparate functional or cultural groups of which society is composed including religious groups, trade unions, professional organizations and ethnic minorities should be autonomous."

(Pluralism) اس تصور کا نام ہے کہ لبرل جمہوری نظام کے اندر اقتدار مختلف معاشی طبقات اور نظریاتی گروہوں کے درمیان منقسم ہوتا ہے (یا منقسم ہونا چاہیے)، بجائے اس کے کہ اقتدار پر صرف ایک اعلیٰ طبقے کا قبضہ ہو۔ Pluralism کے مطابق تنوع کسی بھی سماج کے لیے مفید شے ہے۔ چنانچہ تہذیبی گروہ ہوں یا پیشہ ورانہ انجمنیں، ان کو خود مختاری حاصل ہونی چاہیے۔ ان متنوع گروہوں میں مذہبی گروہ، ٹریڈ یونین اور نسلی اقلیتیں سب شامل ہیں) بہ حوالہ ۲۰۰۵ ایڈیشن۔ نئی دہلی

ان عبارات کی روشنی میں Pluralism یا کثرتیت کے دو معنی سامنے آتے ہیں۔

ایک معنی کے لحاظ سے کثرتیت ایک امر واقعہ کا نام ہے اور وہ واقعہ ہے ”کسی سماج میں متنوع گروہوں کی موجودگی“۔ درج بالا تشریحات میں سے اول الذکر تشریح میں یہی مفہوم نمایاں ہے اور دوسری تشریح میں بھی اس کا ذکر ہے۔ لیکن کثرتیت یا Pluralism کی اصطلاح کے ایک اور معنی بھی ہیں، اس کے لحاظ سے کثرتیت ایک ’رویے‘ (Attitude) یا رجحان کا نام ہے۔ یہ رجحان ہے ’سماج میں متنوع گروہوں کی موجودگی کو ایک پسندیدہ شے سمجھنے کا یا اس تنوع کے سلسلے میں رواداری برتنے کا‘۔ کثرتیت کی اصطلاح کے اس مفہوم کا تذکرہ برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا کی تشریح میں ہے، جو اوپر درج کی گئی ہے اور دوسری تشریح میں بھی اس مفہوم کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

کثرتیت ایک واقعہ

یہ بات کہ انسانی سماج میں مختلف اور متنوع گروہ موجود ہیں، ایک واقعہ ہے۔ اس واقعے کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی سماج میں یہ تنوع رنگ، نسل، علاقے، زبان کا بھی ہے، لباس، طرزِ بود و باش اور ثقافتی مظاہر کا بھی ہے اور عقائد، نظریات اور فلسفہ حیات کا بھی۔ قرآن مجید بھی اس واقعے کا تذکرہ کرتا ہے۔ انسانوں کے درمیان عقیدے اور دین کے فرق کا ذکر کرتے ہوئے قرآن مجید بتاتا ہے کہ اس فرق کی وجہ وہ آزادی ہے جو اللہ نے انسانوں کو دی ہے۔ یہ آزادی اللہ کی مشیت کی بنا پر ہے۔ اُس نے انسانوں کو جبراً کسی ایک راستے کے اختیار کرنے کا پابند نہیں کیا ہے:

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۖ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۖ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِينَ مِن بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ۝

(بقرہ: ۲۵۲، ۲۵۳)

”یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم ٹھیک ٹھیک تم کو سنارہے ہیں اور (اے محمد ﷺ) تم یقیناً اُن لوگوں میں سے ہو جو رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یہ رسول (جو ہماری طرف سے انسانوں کی ہدایت پر مامور ہوئے) ہم نے ان کو ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر مرتبے عطا کیے۔ ان میں کوئی ایسا تھا جس سے خدا خود ہم کلام ہوا، کسی کو اُس نے دوسری حیثیتوں سے بلند درجے دیے اور (آخر میں) عیسیٰ ابن مریم کو روشن نشانیاں عطا کیں اور روح پاک سے اُس کی مدد کی۔ اگر اللہ چاہتا تو ممکن نہ تھا کہ ان رسولوں

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

کی آمد کے بعد جو لوگ روشن نشانیاں دیکھ چکے تھے وہ آپس میں لڑتے، لیکن (اللہ کی) مشیت یہ نہ تھی کہ وہ لوگوں کو جبراً اختلاف سے روکے، اس وجہ سے انھوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی، ہاں اللہ چاہتا تو وہ ہرگز نہ لڑتے، مگر اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔“

عقیدہ و مذہب کے اختلاف کے علاوہ انسانوں میں رنگ اور زبان کا اختلاف بھی موجود ہے۔ قرآن مجید اس کا تذکرہ کرتا ہے:

وَمِنْ آيَاتِهِ خَلْقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ أَلْسِنَتِكُمْ
وَالْوَانِئِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْعَالَمِينَ ○ (روم: ۲۲)

”اور اس (اللہ) کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمھاری زبانوں اور تمھارے رنگوں کا اختلاف ہے، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔
دانش مند لوگوں کے لیے۔“

سورہ فاطر میں ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجْنَا بِهِ ثَمَرَاتٍ مُّخْتَلِفًا
أَلْوَانُهَا ۖ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بَيَضٌ وَحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ أَلْوَانُهَا
وَعَرَابِيٌّ سُودٌ ۖ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَابِّ الْأَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ
أَلْوَانُهُ كَذَلِكَ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ
غَفُورٌ ○ (فاطر: ۲۷، ۲۸)

”کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ آسمانوں سے پانی برساتا ہے اور پھر اُس کے ذریعے سے ہم طرح طرح کے پھل نکال لاتے ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ پہاڑوں میں بھی سفید، سرخ اور گہری سیاہ دھاریاں پائی جاتی ہیں، جن کے رنگ مختلف ہوتے ہیں اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور مویشیوں کے رنگ بھی مختلف ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے بندوں میں سے صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اُس سے ڈرتے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست اور درگزر فرمانے والا ہے۔“

ان آیات کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں میں اختلاف اور تنوع کا وجود بلاشبہ ایک واقعہ ہے۔ اس امر واقعہ سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

کثرتیت بہ طور رویہ

اس حقیقت کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ انسانی سماج میں تنوع اور اختلاف عملاً موجود ہے، یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ اختلاف پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ، مستحسن ہے یا غیر مستحسن۔ قرآن مجید اس سلسلے میں اختلاف اور تنوع کی دو قسموں میں واضح فرق کرتا ہے۔

(الف) جہاں تک انسانوں میں رنگ روپ، نسل، علاقے اور زبان کے فرق کا تعلق ہے، قرآن مجید اس نوعیت کے اختلافات کے سلسلے میں کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کرتا۔ اُس کے نزدیک ان اختلافات سے بعض مصالح وابستہ ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾

”اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔“

(ب) البتہ جہاں تک دین اور عقیدے کے اختلاف کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے تحت اس اختلاف کی آزادی تو انسانوں کو دی ہے، لیکن وہ کفر کے رویے کو پسند نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں ہے:

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَآنَزَلَ لَكُمْ
 مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَنِيَّةً آزَاجٍ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ
 بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمٍ ثَلَاثٍ ذَلِكُمْ اللَّهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَا إِلَهَ إِلَّا
 هُوَ فَأَنَّى تُصْرَفُونَ ۝ إِن تَكْفُرُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ وَلَا يَرْضَىٰ
 لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَإِنْ تَشْكُرُوا يَرْضَهُ لَكُمْ ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ
 أُخْرَىٰ ۚ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّكُمْ مَرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ۚ
 إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ (الزمر: ۷۰)

”اُسی نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر وہی ہے جس نے اُس جان سے اُس کا جوڑا
 بنایا اور اُسی نے تمہارے لیے موشیوں میں سے آٹھ زرمادہ پیدا کیے۔ وہ تمہاری
 ماؤں کے پیٹوں میں تین تین تار یک پردوں کے اندر تمہیں ایک کے بعد ایک شکل
 دیتا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ (جس کے یہ کام ہیں) تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی
 ہے۔ کوئی معبود اس کے سوا نہیں ہے۔ پھر تم کدھر سے پھرائے جا رہے ہو؟ اگر تم کفر
 کرو تو اللہ تم سے بے نیاز ہے، لیکن وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ اور
 اگر تم شکر کرو تو اسے وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے
 کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ آخر کار تم سب کو اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔ پھر وہ تمہیں
 بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ وہ تو دلوں کا حال تک جانتا ہے۔“

اس لیے اُن لوگوں کی رائے غلط ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید نے انسانی سماج کے
 تنوع کو (خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو) ہر حال میں پسندیدہ قرار دیا ہے اور دین و عقیدے کی گم راہی
 سے جو اختلاف نمودار ہوتا ہے اُس پر اپنی ناگواری کا اظہار نہیں کیا ہے۔ مندرجہ بالا آیت میں یہ
 صاف ارشاد موجود ہے کہ ”اللہ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا۔“

رنگ و نسل کے تنوع کی حکمت

سورہ حجرات (آیت ۱۳) میں اللہ تعالیٰ نے قبیلوں اور برادریوں کے فرق کی حکمت یہ بتائی ہے کہ انسان ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ اس فرق کی بنیاد پر کسی تعصب کی گنجائش نہیں ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”اس آیت میں پوری نوع انسانی کو خطاب کر کے اُس عظیم گم راہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالم گیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ اس مختصری آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں: ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہی ہے، ایک ہی مرد اور ایک عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں، جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا، مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کم تر کے امتیازات قائم کیے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں اور ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا، وہ صرف یہ تھی کہ اُن کے درمیان باہمی تعاون اور تعارف کی فطری صورت یہی تھی، تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔“

(ترجمہ قرآن مجید مع مختصر حواشی)

گویا انسانی گروہ جب ایک دوسرے کی منفرد و مخصوص صلاحیتوں کو پہچان لیتے ہیں تو

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

اُن کے لیے باہمی تعاون کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ کوئی قبیلہ تجارت کی خاص صلاحیت رکھتا ہے، کوئی کھیتی باڑی میں آگے ہوتا ہے، کسی کے افراد صنعت و حرفت میں پیش قدمی کر کے اپنی مخصوص مہارت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور کسی قبیلے کے لوگ زیادہ فصیح اور زبان پر قدرت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ جب انسانی نسلوں اور قوموں کی ان متنوع صلاحیتوں کو پہچان لیا جاتا ہے (ان صلاحیتوں کو Recognition حاصل ہو جاتا ہے) تو انسانی گروہوں کے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانے کی اور باہمی تعاون کرنے کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

اسلامی معاشرے میں مختلف نسلوں کا تعاون باہمی

سید قطبؒ لکھتے ہیں:

”اسلامی معاشرے ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس میں اجتماع کا بنیادی رشتہ عقیدے پر استوار ہوتا ہے اور اُس میں عقیدہ ہی وہ سند ہوتا ہے جو کالے اور گورے اور احمر و زرد، عربی اور رومی، فارسی اور حبشی اور اُن تمام اقوام کو روئے زمین پر آباد ہیں، ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتا ہے، جس کا پروردگار صرف اللہ ہوتا ہے۔“

(معالم فی الطريق، باب ہفتم)

”یہ وہ خدا پرست امت ہے جس کے ہر اہل دستے کی شان یہ تھی کہ اُس میں عرب کے معزز خاندان کے چشم و چراغ ابوبکر شامل تھے توحش کے بلال اور روم کے صہیب اور فارس کے سلمان بھی موجود تھے۔ بعد کی نسلیں بھی ہر دور میں اسی دل نشین انداز اور حیرت انگیز نظام کے جلو میں یکے بعد دیگرے منصفہ شہود پر اُبھرتی رہیں۔ عقیدہ توحید اس امت کی قومیت رہی ہے، دارالاسلام اس کا وطن رہا ہے، اللہ کی حاکمیت اس کا امتیازی شعار رہا ہے اور قرآن اس کا دستورِ حیات رہا ہے۔“ (ایضاً، باب نہم)

چنانچہ برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا میں بیان کردہ اس خیال سے اتفاق کیا جانا چاہیے کہ جہاں تک رنگ و نسل کے تنوع کا تعلق ہے، اس نوعیت کے تنوع کی موجودگی کسی سماج

کے لیے ایک مفید شے ہے، اس لیے کہ مختلف گروہ مختلف قسم کی صلاحیتیں رکھتے ہیں اور ان گونا گوں صلاحیتوں سے پورے سماج کو فائدہ پہنچتا ہے۔ رنگ و نسل کے فرق کو ناپسندیدہ سمجھنا ایک غلط رجحان ہے۔ اسلام نے اس غلط رجحان اور اس پر مبنی تعصب کو ختم کیا ہے۔

دین اور عقیدے کا تنوع محض گوارا ہے، مستحسن نہیں

کثرتیت (Pluralism) کی تشریح میں برٹانیکا ریفرنس انسائیکلو پیڈیا میں جو نقطہ نظر درج ہے اُس کے مطابق تو سماج میں ہر قسم کا تنوع پسندیدہ ہے، لیکن اسلامی نقطہ نظر سے یہ بات صحیح نہیں۔ اس کے مطابق رنگ و نسل اور قبیلہ و برادری کا تنوع تو انسانی سماجوں کے لیے مفید ہے، لیکن دین اور عقیدے کے اختلاف کو کوئی پسندیدہ شے نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بعض انسانوں کے کافرانہ طرز عمل کو پسندیدہ نہیں قرار دیا ہے۔ بلکہ اُس پر اپنی 'عدمِ رضا' کا اظہار کیا ہے۔ یہی اندازِ فکر اہل ایمان کا بھی ہونا چاہیے۔

اس سیاق میں اس مقبول عام خیال پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو اکثر سننے میں آتا ہے۔ یہ خیال درج ذیل ہے:

”ہمارا ملک مختلف مذاہب کا گل دستہ ہے۔ اس کی رونق کے لیے اس میں مختلف قسم کے پھولوں کی موجودگی ضروری ہے۔ اگر ایک ہی طرح کے پھول ہوں تو گل دستے میں حُسن نہیں آسکتا۔“

مندرجہ بالا خیال کثرتیت (Pluralism) کے اُس مقبول عام مفہوم کی نمائندگی کرتا ہے، جس کے مطابق دین اور عقیدے کا اختلاف و تنوع ایک پسندیدہ شے ہے۔ لیکن اسلام کا نقطہ نظر یہ نہیں ہے۔ جو مسلمان دانش ور (غالباً بلا غور و فکر کے) مختلف ادیان کے وجود کو گل دستے سے تعبیر کرتے ہیں اُن کو اپنے اس خیال پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ حق اور باطل دونوں کو پھول سے تشبیہ دینا حق اور باطل کے فرق کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ بہ طور امر واقعہ تو حق اور باطل دونوں کا وجود تسلیم کیا جانا چاہیے، لیکن دونوں کو یکساں پسندیدہ نہیں قرار دیا جاسکتا۔

روداداری

دین اور عقیدے کے اختلاف کو مستحسن قرار نہ دینے کے باوجود اسلام نے عملی رویہ میں روداداری کی تعلیم دی ہے۔ روداداری کے اس عملی رویے کی بنیاد عدم اکراہ کا اسلامی اصول ہے۔ حق اور باطل کی اطمینان بخش وضاحت کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آزاد چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے برحق عقیدے یا باطل عقائد کا انتخاب کریں۔ اختیار کی اس آزادی کا انسان غلط استعمال بھی کر سکتا ہے اور صحیح بھی۔ اس سلسلے میں آخرت میں اُسے جواب دہی کرنی ہوگی۔ اختیار کے غلط استعمال اور صحیح استعمال کا انجام بہ ہر حال یکساں نہیں ہوگا۔ اس حقیقت کے باوجود انسانوں کے اس اختیار کو سلب نہیں کیا جاسکتا کہ وہ چاہیں تو حق کو قبول کریں اور چاہیں تو اُس کو رد کر دیں۔

اہل ایمان کا رویہ بھی عدم اکراہ کے اصول کے تابع ہونا چاہیے، یعنی وہ انسانوں کو حق کی طرف لازماً بلائیں اور اتمام حجت کی حد تک حق کو واضح کر دیں، لیکن قبول حق کے سلسلے میں کسی جبر و اکراہ سے کام نہ لیں، بلکہ انسانوں کو آزاد چھوڑ دیں جس طرح اللہ نے اُن کو آزاد چھوڑا ہے۔ عدم اکراہ کے بنیادی اصول کے علاوہ اسلام نے روداداری کے سلسلے میں دیگر بنیادی ہدایات بھی دی ہیں:

(الف) شرک کی مدلل اور واضح تردید کی جائے، لیکن معبودانِ باطلہ کے سلسلے میں ناشائستہ الفاظ استعمال نہ کیے جائیں (جو گالی کی تعریف میں آتے ہوں)

(ب) اگر اقتدار اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو تو دیگر ادیان کے پیروں کو اپنے دین کے مطابق دینی مراسم انجام دینے کی پوری آزادی دی جائے۔

(ج) اہل ایمان کے اقتدار کی صورت میں مذکور بالا آزادی کے علاوہ دیگر ادیان کے حاملین کو تمام ثقافتی امور میں بھی پوری آزادی دی جائے، یعنی وہ اپنا نظام تعلیم چلا سکیں اور معاشرتی معاملات میں اپنے مذہبی قانون پر عمل کر سکیں اور اس حد تک اپنا عدالتی

نظام بھی قائم کر سکیں۔ اصولی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اُن کو تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) دی جائے۔

(د) اہل ایمان اگر اقتدار رکھتے ہوں تو وہ غیر مسلم شہریوں کو مجبور نہ کریں کہ وہ اسلامی

ریاست کے دفاع میں عملاً بھی حصہ لیں۔ بس ان کے مالی تعاون کو کافی سمجھا جائے گا۔

(ہ) اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو کسی ایسے کام کے لیے مجبور نہ کیا جائے جو اُن

کے معتقدات سے ٹکراتا ہو۔

مظاہر کا تنوع

تمدنی مظاہر کا اطلاق کھانے پینے کے انداز، لباس، طرزِ بود و باش، تقریبات، تفریحات اور ناموں کے انتخاب وغیرہ پر ہوتا ہے۔ ان مظاہر کا تعلق ایک طرف دین کی بنیادی تعلیمات سے ہے اور دوسری طرف متنوع اور بدلتے ہوئے حالات و ظروف سے۔ چنانچہ اس موضوع پر غور و فکر کرتے وقت دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

اسلام نے ان امور کے سلسلے میں بعض بنیادی ہدایات دی ہیں اور اُس کے بعد اہل ایمان کو آزاد چھوڑا ہے۔ کھانے پینے کے سلسلے میں اسلام نے اہل ایمان کو ہدایت دی ہے کہ وہ حلال و طیب چیزیں کھائیں اور اسراف نہ کریں۔ ان ہدایات کے تحت جغرافیائی حالات کے لحاظ سے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق مسلمان ہر قسم کے کھانے کھا سکتے ہیں۔ اسلام میں اس تنوع کی پوری گنجائش ہے۔

لباس کے سلسلے میں چند اسلامی ہدایات یہ ہیں کہ ستر کو ڈھکا جائے، مردوں اور عورتوں کے لباس ایک جیسے نہ ہوں، مرد ریشمی لباس نہ پہنیں، لباس حیا اور تقویٰ کا آئینہ دار ہو اور اعتدال کے ساتھ زینت کا اہتمام کیا جائے۔ اسلامی ہدایات کا لحاظ کرتے ہوئے جس لباس کو بھی استعمال کیا جائے گا، اسلام میں اُس کی اجازت ہے۔

عام طور پر تمام تمدنی مظاہر کے سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ شرعی حدود کی پابندی کی

جائے اور اسلامی اقدار کی جھلک تمام مظاہر میں نظر آئے۔ چنانچہ تمدنی مظاہر کے سلسلے میں محدود اور پابند کثرتیت (Limited and Regulated Pluralism) کی اسلام اجازت دیتا ہے۔

مکاتبِ فکر

قرآن و سنت کی حدود کے اندر دین کے مختلف پہلوؤں کی تفصیلات مرتب کرنے میں اہل ایمان کے درمیان پوری ایمان داری کے ساتھ اختلافات ہو سکتے ہیں۔ اس نوعیت کی کثرتیت (Pluralism) کی بھی اسلام میں پوری گنجائش ہے۔ نظامِ تزکیہ، فقہ، طریقِ تفسیر اور کلام سب کے اندر مختلف مکاتبِ فکر ہو سکتے ہیں، بہ شرطے کہ کتاب و سنت کے اندر اُن کی گنجائش ہو۔ ان مکاتبِ فکر کے درمیان صحت مند تبادلہٴ خیال کی روایت قائم ہونی چاہیے، تاکہ مسلمان معاشرہ ہر میدان میں پیش قدمی کر سکے۔

سرودھرم سمبھاؤ

ایک محترم رفیق نے 'سرودھرم سمبھاؤ' کے عنوان پر ایک تحریر ہمارے پاس بھیجی ہے اور فرمائش کی ہے کہ اس پر اظہارِ خیال کیا جائے۔ تحریر درج ذیل ہے:

”سرودھرم سمبھاؤ“ کی اصطلاح گزشتہ تقریباً پندرہ بیس برسوں میں خاصی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ اس کا قریب ترین اردو متبادل 'وحدت ادیان' (ادیان = سرودھرم، سمبھاؤ = یکساں جذبہ، یکساں تاثر، مساوی اہمیت وغیرہ) ہے۔ اگرچہ 'وحدت لفظ' 'سمبھاؤ' کا بالکل درست اردو ترجمہ نہیں ہے، تاہم لفظ سمبھاؤ کے مفہوم میں وحدت و مساوات کا تاثر مضمر (implied) ہے۔ وحدت و مساوات کے سوا اس لفظ سے کوئی دوسرا مفہوم لینا محال نظر آتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کے امتیازی (distinct) مقام و حیثیت کی قوت و اثرات کو زائل کرنے کے لیے اور حق و باطل میں واضح فرق کے بجائے اشتباہ و ابہام کی فضا بنانے کے لیے یہ اصطلاح بنی۔ سب سے پہلے سیاسی مقاصد کے لیے اکبر کے دور میں، وحدت ادیان کا نظریہ دین الہی کے قالب میں ڈھلا، پھر ایک طویل تاریخی فاصلے کے بعد جدید بھارت میں سرودھرم سمبھاؤ کے نئے قالب میں ڈھلا۔ یہ بھی محسوس ہو رہا ہے کہ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں ہندوستان میں دعوتِ اسلامی کا کام بڑھاتا اسے کاؤنٹر کرنے کے لیے باطل نے راست اقدام اور جارحانہ مزاحمت

کو counter productive سمجھتے ہوئے دعوت کا راستہ روکنے کی خاطر بالواسطہ تدابیر میں سے ایک تدبیر کے طور پر سرودھرم سمبھاؤ کے بے ضرر نظریہ کو کافی فروغ دیا۔ گزشتہ پندرہ بیس برسوں کے دوران سرودھرم سٹیلن کے انعقاد اور سرودھرم سمبھاؤ کے موضوع (Theme) پر مختلف مذاہب کے نمائندوں کی 'خیر سگالی تقاریر' کو جس پیمانے پر رواج دیا گیا ہے، وہ باطل کی اسٹریٹیجی سے متعلق مذکورہ بالا احساس کو تقویت دیتا ہے۔

میدانِ دعوت میں کارکنان کو یہ مرحلہ سلسلِ پیش آتا رہا ہے کہ جب اسلام کی حقانیت واضح اور ثابت کر دی جاتی ہے، اتمامِ حجت ہو جاتا ہے، تب ایک بندھا کا جواب (رپانس) ملتا ہے کہ ”ہاں صاحب! بات تو درست ہے۔ سارے دھرم یہی بات کہتے ہیں۔ سچائی تو سارے دھرموں میں ہے، سارے دھرم سچے ہیں۔ سب ایسی ہی اچھی اچھی تعلیم دیتے ہیں۔ نام الگ الگ ہیں، لیکن سچائی تو ایک ہی ہے۔ راستے الگ الگ ہیں، لیکن منزل تو ایک ہی ہے.....“ اس رپانس کو وحدتِ ادیان کا نظریہ بھی کہا جاسکتا ہے اور سرودھرم سمبھاؤ کا نظریہ بھی۔

ہمارے یہاں سرودھرم سمبھاؤ تحریک کے بارے میں کچھ اہل علم اور اصحابِ دانش کا تاثر یہ ہے کہ یہ وحدتِ ادیان کی تحریک نہیں ہے، بلکہ مذہبی قومیتوں میں (انسانی و اخلاقی اقدار کی بنیاد پر) خیر سگالی، حسنِ تعلق، حسنِ معاملت اور پر امن بقائے باہم کی (مثبت اور تعمیری) تحریک ہے۔ لہذا اسے وحدتِ ادیان کی مانند مسترد نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ تاثر (یعنی دونوں اصطلاحوں میں فرق کرنے کا رویہ) غالباً اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ سرودھرم سمبھاؤ سٹیلن کا انعقاد کرنے والے (ہندو مذہبی قائدین) مذہبی قوموں میں خیر سگالی اور حسنِ تعلق کو ہی ایسے جلسوں کے انعقاد کا مقصد و محرک بتاتے ہیں (اور اصل مقصد، یعنی دعوتِ اسلامی یا مسیحی مشن کے اثرات و اقدام کو کاؤنٹر کرنے کی ذہنیت کو چھپا لیتے ہیں)

اسلام کا مزاج اور اس کی صحیح پوزیشن یہ ہے کہ مذکورہ بالا دونوں کیفیتیں باہم مختلف ہیں۔ اسلام مذہبی سطح پر ادیانِ باطلہ کے ساتھ خیر سگالی، رواداری اور پرامن بقائے باہم وغیرہ کا حامی ہرگز نہیں ہے، جب کہ انسانی اقدار کی بنیاد پر مذہبی قوموں (مثلاً مسلم، ہندو، عیسائی وغیرہ) کے درمیان، عدل، انصاف، ادائیگی حقوق، حسن معاملت اور حسن تعلق کی سطح پر خیر سگالی، رواداری اور حسن تعلق و پرامن بقائے باہم کا حامی و موید ہے۔ پس دونوں کیفیات میں ابہام اور کنفیوژن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وحدتِ ادیان اور وحدتِ انسانی دو الگ الگ چیزیں ہیں، لیکن وحدتِ ادیان اور سرودھرم سمجھاؤ اصلاً ایک ہی شے ہے، قطع نظر اس کے کہ سرودھرم سمجھاؤ کو پیش کرنے والی (ہندو مذہبی) شخصیات اسے کسی بھی اسلوب، کسی بھی آہنگ میں پیش کریں۔ سرودھرم سمجھاؤ کو وحدتِ ادیان نہ ماننا دراصل دعوتِ اسلامی کی Antithesis ہے۔“

مذہب اور اُس کے علم بردار

اس تحریر پر اظہارِ خیال سے پہلے ایک ضروری تصریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ یہ تصریح کسی مذہب کے تصورات اور اُس مذہب کے نام لیواؤں کے عملی رویے میں فرق سے متعلق ہے۔ عموماً مغربی مصنفین ان دونوں چیزوں میں فرق نہیں کرتے۔ مثلاً وہ ’اسلام‘ اور ’مسلمان‘ کے الفاظ کو مترادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہی طرزِ تحریر وہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی اختیار کرتے ہیں، حالاں کہ صحیح تجزیے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں امور میں واضح فرق کیا جائے۔ ایک مذہب کے تصورات وہ ہیں جو اس کے مستند منبع (source یا sources) سے ہمیں معلوم ہوں۔ مزید برآں ان تصورات کی وہی تعبیر و تشریح صحیح سمجھی جانی چاہیے جو اصل متن سے مطابقت رکھتی ہو۔ رہا کسی مذہب کے وابستگان کا عملی رویہ تو وہ مذہب کے اساسی تصورات کے مطابق بھی ہو سکتا ہے اور اُن کے مغائر بھی۔ ان دونوں امور — اساسی تصورات اور عملی رویے — کو گڈ مڈ کرنے سے کسی مذہب کے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔

اس تصریح کی ضرورت خاص طور پر اسلام کے سلسلے میں ہے۔ اصولاً اسلام نام ہے اُن بینات کا جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں۔ تمام مسلمان قرآن و سنت کو دین کا اصل منبع تسلیم کرتے ہیں اور ان بنیادوں پر وہ سب متفق ہیں۔ البتہ مسلمانوں کے عملی رویے میں کوتاہی ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کے انفرادی اور اجتماعی کاموں کو اسلام کی کسوٹی پر پرکھا جاسکتا ہے اور پرکھا جانا چاہیے، لیکن مسلمانوں کے ہر کام اور ہر رویے کو لازماً اسلام کا نمائندہ یا ترجمان قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس تصریح کے بعد ہم اصل مسئلے کی طرف پلٹتے ہیں جو ’سرو دھرم سمبھاؤ‘ کے تصور سے متعلق ہے۔

بنیادی نکات

پیش نظر تحریر کے بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

(الف) ’سرو دھرم سمبھاؤ‘ کے معنی ’وحدتِ ادیان‘ کے ہیں۔

(ب) اس اصطلاح کے پیش کرنے والوں کا مقصد ماضی میں یہ تھا اور آج بھی ہے کہ دعوتِ اسلامی کی قوت اور زور کو توڑا جائے اور حق و باطل کے امتیاز کو دھندلا کر دیا جائے۔

(ج) ’سرو دھرم سمبھاؤ‘ کی اصطلاح کا ایک مفہوم یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سے مراد خیر سگالی اور پُر امن بقائے باہم ہے۔ جو لوگ ’سرو دھرم ستمیلن‘ کے عنوان کے تحت اجتماعات منعقد کرتے ہیں وہ یہی مفہوم بیان کرتے ہیں، لیکن یہ اس اصطلاح کا اصل مفہوم نہیں ہے۔

(د) اس سلسلے میں اسلام کا موقف یہ ہے کہ اسلام مذہبی تصورات کی سطح پر ادیانِ باطلہ کے ساتھ پُر امن بقائے باہم کا قائل نہیں ہے۔

(ه) البتہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مختلف مذہبی گروہوں کے سلسلے میں عدل و انصاف اور حسنِ معاملت کا رویہ اختیار کیا جائے۔ یہ رویہ وحدتِ بنی آدم کے اسلامی تصور کا عکاس ہے۔ اب ہم ان نکات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

دھرم اور سمبھاؤ کے معنی

اگرچہ لفظ دھرم کے ابتدائی لغوی معنی 'فرض' یا 'لازمی وصف' کے ہیں لیکن جب 'سرو دھرم سمبھاؤ' کے الفاظ بولے جاتے ہیں تو وہاں دھرم سے مراد دین یا مذہب ہوتا ہے۔ فادر کامل بلکہ کی مرتب کردہ 'ہندی-انگریزی ڈکشنری' میں یہ دونوں مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ لفظ 'دھرم' کے انگریزی متبادل کے طور پر ڈکشنری کے مرتب نے ذیل کے الفاظ درج کیے ہیں:

"Property, Quality, Attribute" یعنی وصف اور Faith, Religion

Religious persuaion یعنی مذہب (یکتھولک پریس، رانچی، مطبوعہ ۲۰۰۸ء)

البتہ ڈکشنری کے مصنف نے مرکب الفاظ میں دھرم سے دین یا مذہب ہی مراد لیا ہے۔ مثلاً 'دھرم گرنٹھ' کے معنی انھوں نے Holy Writ یا Scripture درج کیے ہیں۔ اس لیے لغوی اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب دھرم کی اصطلاح 'سمبھاؤ' کے لفظ کے ساتھ استعمال ہوگی تو وہاں اُس کا مفہوم دین یا مذہب لینا ہی درست ہوگا۔

چنانچہ لغوی اعتبار سے دیکھا جائے تو زیر تبصرہ تحریر کے پہلے نکتے کو درست قرار دیا جانا چاہیے، یعنی یہ کہ 'سرو دھرم سمبھاؤ' کی اصطلاح کا مفہوم وحدتِ ادیان ہے۔ گویا اردو داں حضرات وحدتِ ادیان کے الفاظ سے جو کچھ مراد لیتے ہیں وہی مراد ہندی اصطلاح 'سرو دھرم سمبھاؤ' کے استعمال کرنے والوں کی ہوتی ہے۔

تصور وحدتِ ادیان کا محرک

زیر تبصرہ تحریر میں 'وحدتِ ادیان' کا تصور پیش کرنے والوں کا اصل منشا دعوتِ حق کا راستہ روکنا قرار دیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ بات صحیح ہے، لیکن اس منفی جذبے کے علاوہ تصورِ وحدتِ ادیان کے پیچھے بعض محرکات اور بھی ہیں۔ اُن میں سے ایک محرک یہ ہے کہ مذہبی اختلافات کو

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

ضمنی، فروعی اور ناقابل لحاظ قرار دے کر اُن جھگڑوں کو ختم کر دیا جائے جو مذہب کے نام پر دنیا میں رائج ہیں۔ دوسرا محرک اُن لوگوں کے ذہن میں ہے جو خود نفس مذہب کو زندگی کے اجتماعی معاملات سے بے دخل کرنا چاہتے ہیں اور کسی سیکولر فلسفہ زندگی کو غالب و نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کا ادعا یہ ہے کہ مذہب انسان کی پرائیویٹ زندگی سے متعلق ایک معاملہ ہے۔ چنانچہ مذہبی اختلافات کسی نجیدہ توجہ کے مستحق نہیں ہیں۔ آدمی جس مذہب کو بھی چاہے، اختیار کر لے، زندگی کے اہم تر اجتماعی معاملات میں اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اُن اجتماعی امور میں سب لوگوں کو بلا امتیاز مذہب ایک ہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے، جو سیکولر فلسفہ حیات پر مبنی ہو۔

فلسفہ وحدتِ ادیان کے پیچھے ایک اور محرک یہ خیال ہے کہ انسان اگر نیک نیتی کے ساتھ زندگی گزارنے کا راستہ تلاش کرے تو وہ جس نتیجے پر بھی پہنچ جائے وہ درست ہے۔ اس خیال کے حاملین کو Relativists یا 'اضافیت' کے قائلین کہا جاسکتا ہے، گویا اُن کے نزدیک 'مطلق حق' کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے، بلکہ حق یا سچائی کے مختلف روپ یا درجات ہیں۔ آدمی جس درجے تک بھی پہنچ جائے وہ اُس کے لیے کافی ہے۔

اس کے برعکس خیال اُن لوگوں کا ہے جو یہ سمجھتے ہیں کہ 'مطلق حق' غالباً موجود تو ہے، لیکن انسان کے بس میں نہیں ہے کہ حق کو تلاش کر سکے۔ اس خیال کے حاملین کے نزدیک مذہبی اختلافات کا وجود ہی خود اس بات کی دلیل ہے کہ انسان حق کی تلاش میں ناکام رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا، اس لیے حق کی تلاش کے خیال کو ہی چھوڑ دینا چاہیے اور آدمی اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے جس راستے کو بھی چن لے، وہ ٹھیک ہے۔

وحدتِ ادیان کے فلسفے کا ایک اور محرک اُن لوگوں کا خیال ہے جو ہندوستان کے روایتی مشرکانہ تصورِ کائنات، تصورِ آداگون اور ذاتِ پات کی تقسیم کو قبول کرتے ہیں اور اُن تصورات پر مبنی سماجی ڈھانچے کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ جب 'وحدتِ ادیان' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اُن کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ مذہبی مراسم اور پرستش کے طریقوں کے تنوع میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطے کہ اُن سب میں مذہبی طبقے کی رائج اجارہ داری کو اور

ذات پات کے نظام کو تسلیم کیا گیا ہو۔ جب تک اس سماجی ڈھانچے اور اُس کے اساسی تصورات کو چیلنج نہ کیا جائے، وہ مذہبی طور طریقوں اور رسوم و رواج میں ہر جدت اور ہر تنوع کو درست اور ناقابل اعتراض سمجھتے ہیں۔

فلسفہ وحدتِ ادیان کے مندرجہ بالا اعتراضات باہم مختلف ضرور ہیں، مگر اُن سب میں یہ بات مشترک ہے کہ اُن کے قائلین مذاہب کے موجودہ اختلاف کی حقیقی وجہ تلاش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ چوں کہ فلسفہ وحدتِ ادیان ہمارے ملک میں بہت مقبول ہے، اس لیے اِن محرکات کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ان کی اصل کم زوری سامنے آ سکے۔

کیا مذاہب کے اختلافات فروعی ہیں؟

جولوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مذاہب کے درمیان اختلافات محض فروعی نوعیت رکھتے ہیں، اُن کو دنیا کے مشہور مذاہب کے اساسی تصورات کا سنجیدگی سے جائزہ لینا چاہیے۔ یہ اُن کی خواہش ضرور ہو سکتی ہے کہ مذاہب کے درمیان اختلافات مٹ جائیں، لیکن اُن کو حقائق کا انکار نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً خدا کے تصور کو لیجیے۔ کسی مذہب کو سمجھنے کے سلسلے میں یہ سوال بنیادی اہمیت کا حامل ہے کہ اس مذہب میں خدا کا تصور کیا ہے؟ آبادی کے اعتبار سے ہمارے ملک کا سب سے بڑا مذہب وہ ہے جسے ہندو مذہب کہا جاتا ہے۔ اس کا ابتدائی دور ویدک دور ہے۔ اُس دور کے بعد مذہب کی وہ شکل سامنے آئی جو ہندوستان کے طول و عرض میں آج پائی جاتی ہے۔ یہ رائج مذہب مشرکانہ مذہب ہے۔ اس بارے میں جناب عماد الحسن آزاد فاروقی لکھتے ہیں:

”ویدک دور کے برخلاف..... مہا بھارت اور رامائن میں نئے دیوی دیوتاؤں میں سے ہر ایک اپنے ماننے والوں کی تمام تر توجہ کا حق دار ہوتا ہے۔ کسی دیوتا کے بھکت کی عقیدت کا اصل مرکز اُس کا اِشٹ (چنیدہ) دیوتا ہوتا ہے اور وہ دوسرے دیوتاؤں کو اُس کا ماتحت یا اُسی کے مختلف مظاہر (روپ) مانتا ہے۔“

(دنیا کے بڑے مذاہب، باب اول)

عصر حاضر کے پُر فریب نعرے

مندرجہ بالا بیان کردہ تصور الوہیت واضح طور پر ایک مشرکانہ تصور ہے۔

مذکورہ بالا برہمنی مت کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری مذہبی روایت بھی ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ بدھ مت اور جین مت اسی روایت سے متعلق ہیں۔ ان مذاہب کے اندر خدا کے تصور سے یک گونہ بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اس روایت کو 'شرمن روایت' کہا جاتا ہے۔ جناب آزاد فاروقی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتے ہیں:

”برہمنی مت کے متوازی اور اُس سے مختلف مذہبی اور فکری روایت کو شرمن روایت کے نام سے یاد کیا گیا ہے..... ایک اہم فرق جو شرمن روایت سے متعلق مکاتبِ فکر اور مذاہب نیز برہمنی مت (کے مابین) واضح نظر آتا ہے، وہ شرمن روایت کا خدا کے تصور سے بے نیاز ہونا ہے، جب کہ برہمنی روایت کسی نہ کسی صورت میں، خواہ وہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کا مشرکانہ تصور ہی ہو، الوہیت کی قائل رہی ہے۔ شرمن روایت کے مختلف مکاتبِ فکر میں الوہیت یا خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

(ایضاً، باب سوم)

اس کے بعد سامی مذاہب آتے ہیں، جو اصولاً توحید کے قائل ہیں۔ جناب آزاد فاروقی لکھتے ہیں:

”یہودیت کے ساتھ ہم مذہبی اعتبار سے ایک نئی دنیا میں قدم رکھتے ہیں، جس کو ہم سامی خاندان کی دنیا سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس خاندان میں یہودیت، عیسائیت اور اسلام جیسے تین بڑے مذاہب شامل ہیں یہ اسی مشترک مذہبی ورثہ کا احساس ہے جو ہمیں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ کے (تصور) خدا میں کسی تفریق کا تصور بھی نہیں ہونے دیتا۔

حضرت ابراہیمؑ کو..... عنایتِ الہی کے طفیل ایک ایسی معرفت حاصل ہوئی جو بنی نوعِ انسان کی مذہبی زندگی کے لیے کسی انقلاب سے کم نہ تھی۔ حضرت ابراہیم کی رسائی ایک

ایسی ہستی کی معرفت تک ہوگئی جو بلا شرکتِ غیرے تمام کائنات اور انسان کا خالق، مالک اور حکم ران ہے۔ ایک ایسے معبود کا ادراک و احساس، جو مادی فطرت کا ایک حصہ نہیں ہے، بلکہ اُس پر حاکم ہے، جو قبائلی اور مقامی دیوتاؤں کی طرح محدود جماعتوں کا مقصود نہ ہو کر تمام انسانوں کا خالق اور پالنہار ہے اور جو اپنی حکم رانی اور ربوبیت میں یکتا اور یگانہ ہے، ایسا مذہبی تجربہ تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ اور ان کی نسلی ور حانی اولاد کو ممتاز کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ کے معبود خدا کی (مذکورہ بالا) تین خصوصیات میں پہلی 'تنزیہی' دوسری 'آفاقیت' اور تیسری 'توحید' کی ترجمان ہے۔“ (ایضاً، باب ششم)

ان اقتباسات سے ذیل کے امور واضح ہوتے ہیں:

- (الف) دنیا کے معروف مذاہب الوہیت کے بارے میں متفق الخیال نہیں ہیں۔
 - (ب) ہندوستان میں رائج برہمنی مت متعدد معبودوں کا قائل اور شرک کا علم بردار ہے۔
 - (ج) شرمن روایت (جس میں بدھ مت اور جین مت شامل ہیں) تصور الوہیت سے بحث نہیں کرتی، گویا یہ مذاہب خدا کے سلسلے میں خاموش ہیں۔
 - (د) سامی مذاہب (یہودیت، عیسائیت اور اسلام) اصولاً توحید کے قائل ہیں (اگرچہ تثلیث کے عقیدے کی شکل میں عیسائیت میں شرک کی آمیزش ہوگئی ہے)۔
- یہ مذہب سے متعلق صرف ایک سوال یعنی 'تصور الوہیت' کے بارے میں گفتگو تھی۔ کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس معاملے میں مذاہب عالم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے، یا یہ اختلاف محض ضمنی اور فرعی نوعیت کا ہے؟ یہی معاملہ مذہب سے متعلق دوسرے بنیادی سوالات کا ہے، مثلاً حیات بعد المات، تصورِ نجات، طریقِ عبادت، کائنات میں انسان کی حیثیت وغیرہ۔ ان تمام معاملات کے سلسلے میں مذاہب عالم کے تصورات باہم مختلف ہیں اور ان اختلافات کو ناقابلِ لحاظ نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ مذہبی اختلاف کی موجودگی کو ایک ثابت شدہ واقعہ تسلیم کیا جائے۔

مذہب پر ایٹمیٹ معاملہ نہیں ہے

جو لوگ مذہب کو پر ایٹمیٹ (نجی) معاملہ قرار دیتے ہیں اور اس بنا پر وحدت ادیان کے قائل ہیں، وہ یا تو جان بوجھ کر غلط بات کہتے ہیں یا مذہب عالم کی تعلیمات سے بے خبر ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور اسلامی مفکر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی نے بہت اچھا تجربہ پیش کیا ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”مذہب کو پر ایٹمیٹ معاملہ قرار دینے والوں کو یہ سوچنا چاہیے کہ اُن کو ایسا کرنے کا حق کس نے دیا؟ کیا دنیا کے بڑے مذاہب خود اپنی یہ حیثیت متعین کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کسی کو اس کا بات کیا حق پہنچا ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہمہ گیر ہدایات کی حدود متعین کرتا چلے۔ آج جو مذہب تحریف و ترمیم سے جس قدر محفوظ ہیں اسی قدر وہ اس بات کا پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں کہ خدا کی اطاعت انسان کی پوری زندگی میں ہونی چاہیے۔ وہ ایسے قوانین و ضوابط پیش کرتے ہیں جنہیں کسی بھی طرح زندگی کے ”پر ایٹمیٹ“ معاملات تک محدود نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دنیا کے اکثر مذاہب سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ سود کا تعلق انسانی زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہے۔“

اسی طرح کیا مرد اور عورت کے آزادانہ اختلاط کو ممنوع قرار دے کر اور نکاح کے طریقے نیز خاندان کے ادارے کو محترم قرار دے کر مذہب انسان کی معاشرتی زندگی کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتا۔ کوئی ہٹ دھرمی پر اتر آئے تو دوسری بات ہے، ورنہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ مذاہب عالم اپنی تعلیمات کے لحاظ سے انسان کی پوری زندگی (اجتماعی اور انفرادی) کو اپنی رہ نمائی کا میدان قرار دیتے ہیں اور کسی طرح کی حد بندی کے قائل نہیں۔“

(اسلامی نشاۃ ثانیہ کی راہ، مطبوعہ دہلی، ۱۹۷۴ء)

کچھ لوگ وحدتِ ادیان کے اس لیے قائل ہیں کہ اُن کے خیال میں حق موجود ہی نہیں ہے، یا اگر موجود ہے تو اُس کو پانا انسان کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح سوچنے والے لوگ خالقِ کائنات سے یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ اُس نے انسانوں کی مادی ضرورتوں کے پورا کرنے کا تو انتظام کیا ہے، لیکن اس کی ہدایت کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ پورا انتظام کائنات خالق کی صفاتِ رحمت و ربوبیت کی شہادت دے رہا ہے اور اپنی انہی صفات کی بنا پر خالقِ کائنات نے تاریخ کے ہر دور میں انبیاء و رسل کے ذریعے راہِ حق انسانوں تک پہنچانے کا انتہائی حکیمانہ و اطمینان بخش انتظام کیا ہے۔ اس لیے راہِ حق کی تلاش کے سلسلے میں کسی مایوسی کا شکار ہو کر جو لوگ وحدتِ ادیان کی طرف مائل ہوئے ہیں، اُن کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ راہِ حق موجود بھی ہے اور واضح بھی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ انسان انبیاء و رسل کی پیش کردہ دعوت پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے اور اس دعوت کو قبول کرنے اور اس کے مطالبات پورے کرنے کے لیے جو قربانی درکار ہو، اسے پیش کرنے کے لیے بلا تردد آمادہ ہو جائے۔ جو شخص اخلاص کے ساتھ انبیاء و رسل کی تعلیمات پر غور کرے گا، اُسے اُن کی حقانیت میں کوئی شبہ نہیں رہے گا اور پھر اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی کہ وہ بلاوجہ تمام مختلف راستوں کو بہ یک وقت درست قرار دے اور اس تضادِ فکری کو رواداری سمجھے۔

بقائے باہم کا معاملہ

بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلام کے ماننے والوں کی دلی تمنا کیا ہے؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں حق اور باطل دونوں پہلو بہ پہلو موجود رہیں اور اُن کے درمیان 'بقائے باہم' کی کیفیت پائی جائے یا اُن کی دلی تمنا یہ ہے کہ انسانی سماج سے باطل مٹ جائے اور حق غالب و ظاہر ہو۔ اس سلسلے میں قرآن مجید کا فیصلہ واضح ہے:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ
كُلِّهِ ۚ وَكَفَى بِاللَّهِ شَهِيدًا ۝ (الف: ۲۸)

”وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا، تاکہ اُسے تمام دینوں پر غالب کر دے اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔“

يُرِيدُونَ لِيُظْفَرُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ۝ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ۝ (الصف: ۸-۹)

”یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھادیں، لیکن اللہ اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے، تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کر دے، چاہے یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی ناگوار ہو۔“

أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَابِيًا ۚ وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ ۚ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَأَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً ۚ وَأَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ۚ كَذَلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ۝ (الرعد: ۱۷)

”اللہ نے آسمان سے پانی اتارا اور ہر ندی نالہ اپنے ظرف کے مطابق اسے لے کر چل نکلا۔ پھر جب سیلاب اٹھا تو سطح پر جھاگ بھی آ گئے۔ اور ایسے ہی جھاگ اُن دھاتوں پر بھی اٹھتے ہیں جنہیں زیور اور برتن وغیرہ بنانے کے لیے لوگ پگھلایا کرتے ہیں۔ اسی مثال سے اللہ حق اور باطل کے معاملے کو واضح کرتا ہے۔ جو جھاگ ہے وہ اڑ جایا کرتا ہے اور جو چیز انسانوں کے لیے نافع ہے وہ زمین میں ٹھہر جاتی ہے۔ اس طرح اللہ مثالوں کے ذریعہ اپنی بات سمجھاتا ہے۔“

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعِيبِينَ ۝ لَوْ أَرَدْنَا أَنْ

نَتَّخِذَ لَهُوَ إِلَّا نَحْنُ مِنْ لَدُنَّا إِنَّ كُتَابَ فَعِلَيْنَ ۝ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ
عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ۖ وَلَكُمْ الْوَيْلُ مِمَّا
تَصِفُونَ ۝ (الانبیاء: ۱۶-۱۸)

”ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ اُن میں ہے، کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا ہے۔ اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور بس یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔ مگر ہم تو باطل پر حق کی چوٹ لگا دیتے ہیں جو اس کا سر توڑ دیتی ہے اور وہ دیکھتے دیکھتے مٹ جاتا ہے۔ اور تمہارے لیے تباہی ہے اُن باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔“

ان آیات سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دعوتِ اسلامی کا مقصود یہ ہے کہ دنیا میں حق غالب ہو اور باطل معدوم یا مغلوب ہو جائے۔ اسلام حق اور باطل کے درمیان بقائے باہم کو اپنا مقصود قرار نہیں دیتا۔ البتہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے یہ بات واضح ہے کہ جہاں تک افراد کا معاملہ ہے اُن کو قبولِ حق کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ وہ چاہیں تو حق کو قبول کریں اور چاہیں تو اس کا انکار کر دیں۔

لَا تُكْرَاهُوا فِي الدِّينِ. (البقرة: ۲۵۶)

”دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔“

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۖ إِنَّا
اعْتَدْنَا لِلظَّالِمِينَ نَارًا ۖ أَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۖ وَإِنْ يَسْتَغِيثُوا
يُعَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ ۚ بِئْسَ الشَّرَابُ ۖ وَسَاءَتْ
مُرْتَفَقًا ۝ (الکہف: ۲۹)

”صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے مان لے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے (لیکن یہ نہ سمجھو کہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا

بلکہ ہم نے انکار کرنے والے ظالموں کے لیے ایک آگ تیار کر رکھی ہے، جس کی لپٹیں انہیں گھیرے میں لے چکی ہیں۔ وہاں اگر وہ پانی مانگیں گے تو ایسے پانی سے اُن کی تواضع کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ جیسا ہوگا اور اُن کا منہ بھون ڈالے گا۔ بدترین پینے کی چیز اور بہت بری آرام گاہ۔“

اس لیے اسلام کا موقف یہ نہیں ہو سکتا کہ حق و باطل کے درمیان بقائے باہم مطلوب ہے۔ البتہ اسلام کا موقف یہ ہے کہ حق کو قبول کرنے یا نہ کرنے کی جو آزادی اللہ نے انسانوں کو دی ہے، اُس آزادی کو سلب نہیں کیا جاسکتا۔

غیر مسلم افراد کے ساتھ حسنِ معاملت

اسلام باطل کو دنیا سے مٹا کر حق کو غالب کرنا چاہتا ہے۔ البتہ جہاں تک عام غیر مسلم افراد کا معاملہ ہے، اگر وہ حق کی مخالفت نہ کر رہے ہوں تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

”کفار کے ساتھ تین قسم کے معاملے ہوتے ہیں: موالات یعنی دوستی، مدارات یعنی ظاہری خوش خلقی اور مواسات یعنی احسان اور نفع رسانی۔

(۱) موالات (یعنی قلبی دوستی) تو کسی حال میں جائز نہیں۔

(۲) مدارات تین حالتوں میں درست ہے۔ ایک دفعِ ضرر (یعنی نقصان سے بچنے) کے واسطے، دوسرے اُس کافر کی مصلحتِ دینی یعنی ہدایت کی توقع کے واسطے، تیسرے اکرامِ ضیف (یعنی مہمان کے احترام) کے لیے۔

(۳) مواسات یعنی احسان و نفع رسانی تو یہ اہل حرب کے ساتھ (یعنی لڑنے مرنے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والے کافروں کے ساتھ) ناجائز ہے اور غیر اہل حرب (یعنی جو ایسے نہ ہوں) اُن کے ساتھ جائز ہے۔

(البتہ) حربیوں (یعنی لڑنے والے کفار کے ساتھ) کسی خاص موقع پر احسان کرنے میں اسلام کی مصلحت ہو، یا اُس کے اسلام کی توقع ہو تو یہ صورت اُس سے مستثنیٰ ہے۔ (یعنی ایسے وقت حربیوں کے ساتھ احسان کرنا بھی درست ہے)۔

اسی طرح کسی حربی کی اضطراری حالت ہو، مثلاً بھوک، پیاس یا گر جانے سے ہلاکت کے قریب ہو تو یہ صورت بھی مستثنیٰ ہے۔ (یعنی عام حالات میں ایسے حربی کافر کی جان بچائی جائے گی، البتہ خاص حالات یعنی لڑنے کی حالت میں نہیں)۔

(بہ حوالہ ”افادات اشرفیہ“ نیز ”اشرف السوانح“)

چنانچہ زیر تبصرہ تحریر کی یہ رائے درست ہے کہ عام غیر مسلموں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آیا جائے، البتہ جو دین حق کی راہ میں مزاحم ہوں وہ اس حسن سلوک کے مستحق نہیں ہیں، اگرچہ اُن کے انسانی حقوق کا ہر حال میں احترام کیا جائے گا۔

راست اسلوب دعوت کی ضرورت

مغربی تہذیب تاریخ کے اُس مرحلے سے گزر رہی ہے جہاں اُس کے پاس کوئی ایسا فلسفہ یا نظریہ نہیں رہ گیا ہے جس پر اسے خود اطمینان ہو۔ اس لیے شیطان کے لیے اب یہ تو ممکن نہیں رہا کہ وہ انسانوں کو راہِ حق سے روکنے کے لیے مغربی تہذیب کے نظریات اور فلسفوں کو مؤثر طور پر استعمال کر سکے، البتہ وہ وقتاً فوقتاً بعض نعرے اور دل فریب اصطلاحات سامنے لاتا رہتا ہے، جن کے ذریعے وقتی طور پر ہی سہی، انسانوں کو راہِ حق سے روکا جاسکتا ہے، یا اُن کے ذہنوں میں انتشار (Confusion) پیدا کیا جاسکتا ہے۔ ان دل فریب نعروں میں سے ایک InterFaith Dialogue (بین المذاہب ڈائیلاگ) کا نعرہ ہے۔ بہت سے مسلمان بھی اس کی تائید میں کوئی حرج نہیں سمجھتے اور اس کے مضمرات کا تجزیہ کرنے میں انھوں نے تساہل اور سطح بینی سے کام لیا ہے۔

ڈائیلاگ کا مفہوم

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ 'ڈائیلاگ' کے معنی صرف 'بات چیت' یا 'گفتگو' کے ہوتے ہیں (اس لیے اردو میں 'ڈائیلاگ' کا ترجمہ 'مکالمہ' بھی کیا جاتا ہے) لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ ڈائیلاگ کے اصل معنی 'دو مختلف نقطہ ہائے نظر کے درمیان مفاہمت کے لیے کی جانے والی

گفتگو کے ہیں (اور محض 'گفتگو' کے نہیں ہیں)۔ ڈائلاگ کا مقصد 'سمجھوتہ' یا 'معاہدہ' ہوتا ہے، جب کہ 'گفتگو' عام لفظ ہے۔ اور اس کا مقصد 'دعوت' بھی ہو سکتا ہے، معلومات بہم پہنچانا بھی اور 'سمجھوتہ' بھی۔

Cambridge International Dictionary میں Dialogue کے تحت

لکھا گیا ہے:

"Formal talks between opposing countries, political groups, etc. who have previously not had good relationships."
(2002 Edition)

”دو ایسے مخالف ممالک یا سیاسی دھڑوں کے درمیان باضابطہ گفتگو، جن کے درمیان تعلقات خوش گوار نہ رہے ہوں۔“

New Shorter Oxford English Dictionary میں Dialogue کے تحت ہے:

"Diplomatic contact between representatives of two nations or blocks."
(1993 Edition)

”دو قوموں یا بلاکوں کے نمائندوں کے درمیان سفارتی رابطہ۔“

ڈائلاگ یا دعوت؟

قرآن مجید انسانوں سے خطاب کے جو اسالیب اختیار کرتا ہے، اُن میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے 'ڈائلاگ' کے ہم معنی سمجھا جاسکتا ہو، یعنی جہاں انسانوں میں مختلف نقطہ ہائے نظر اور ادیان کے حامل گروہوں سے یہ کہا گیا ہو کہ راہِ حق کا تعین کرنے کے لیے 'وہ باہم مذاکرات کے ذریعے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی کوشش کریں'۔ اس کے برخلاف قرآن مجید تو یہ کہتا ہے کہ اللہ نے حق یا سیدھا راستہ بالکل واضح کر دیا ہے اور انسانوں کی کام یابی اس میں ہے کہ وہ اس کو اختیار کریں:

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۚ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ

بِالطَّاعُونَ وَيُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا
انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ (البقرة: ۲۵۶)

”دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت گم راہی سے تیز کر دی گئی ہے۔
اب جو طاعوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے، اس نے ایسا مضبوط سہارا تھام
لیا جو ٹٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا ہے۔“

دعوتِ اسلامی کے سلسلے میں بنیادی ہدایت سورہ نحل میں ملتی ہے:

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ
بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيلِهِ وَهُوَ
أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ۝ (النحل: ۱۲۵)

”اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور اُن سے
مباحثہ کرو اس طریقے سے جو بہترین ہو۔ بلاشبہ تمہارا رب بہتر جانتا ہے کہ کون
راہِ راست سے بھٹکا ہوا ہے اور کون سے لوگ ہدایت یاب ہیں۔“

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اوپر کی آیتوں میں مخاطبین کو آگاہ کرنا تھا کہ یہ پیغمبر اصل ملتِ ابراہیمی کو لے کر
آئے ہیں۔ اگر کام یابی چاہتے ہو اور حنیف ہونے کے دعوے میں سچے ہو تو اس
راستے پر چل پڑو۔“

أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ الخ سے خود پیغمبر ﷺ کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ لوگوں کو
راستے پر کس طرح لانا چاہیے؟ اس کے تین طریقے بتلائے: حکمت، موعظتِ حسنہ
اور جدالِ احسن۔

’حکمت‘ سے مراد یہ ہے کہ نہایت پختہ اور اہل مضامین مضبوط دلائل و براہین کی روشنی
میں حکیمانہ انداز میں پیش کیے جائیں، جن کو سن کر فہم و ادراک اور علمی ذوق رکھنے والا

طبقہ گردن جھکا سکے۔ دنیا کے خیالی فلسفے اُن کے سامنے ماند پڑ جائیں اور کسی قسم کی علمی و دماغی ترقیات وحی الہی کے بیان کردہ حقائق کا ایک شوشہ تبدیل نہ کر سکیں۔

’موعظتِ حسنہ‘ مؤثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے، جن میں نرم خوئی اور دل سوزی کی روح بھری ہو۔ اخلاص، ہمدردی اور شفقت و حسن اخلاق سے خوب صورت اور معتدل پیرائے میں جو نصیحت کی جاتی ہے، بسا اوقات پتھر کے دل بھی (اسے سن کر) موم ہو جاتے ہیں، مُردوں میں جانیں پڑ جاتی ہیں، ایک مایوس و پژمردہ قوم جھرجھری لے کر کھڑی ہو جاتی ہے اور لوگ ترغیب و ترہیب کے مضامین سن کر منزلِ مقصود کی طرف بے تابانہ دوڑنے لگتے ہیں۔ اور بالخصوص جو زیادہ عالی دماغ اور ذکی و فہیم نہیں ہوتے، مگر طلبِ حق کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں، اُن میں مؤثر و عظم و پند سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جاسکتی ہے، جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات کے ذریعے سے ممکن نہیں۔“ (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

مباحثہ

’ڈائلاگ‘ اور مباحثہ میں فرق یہ ہے کہ ’ڈائلاگ‘ میں ’کسر و انکسار‘ کے ذریعے دو مختلف نقطہ ہائے نظر میں کچھ ’چلک‘ پیدا کی جاتی ہے، تاکہ اُن کے درمیان سمجھوتہ ہو سکے۔ اس کے برعکس ’مباحثہ‘ میں ہر فریق اپنے نقطہ نظر پر قائم رہتا ہے اور اُس کی تائید میں اپنے دلائل پیش کرتا ہے۔ قرآن مجید نے ’ڈائلاگ‘ کے بجائے ’مباحثہ‘ کی اجازت دی ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جب مخاطب ’حکمت‘ اور ’موعظتِ حسنہ‘ کے باوجود قبولِ حق کی جانب مائل نہ ہو۔ البتہ یہ مباحثہ بہترین انداز میں ہونا چاہیے۔ اس بہترین انداز کو جدالِ احسن کہا گیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مزید فرماتے ہیں:

”دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی جماعت بھی موجود رہی ہے جس کا کام ہر چیز میں الجھنا اور بات بات میں جھجیتیں نکالنا اور کج بحثی کرنا ہے۔ یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول

کرتے ہیں نہ وعظ و نصیحت سنتے ہیں، بلکہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلے میں بحث و مناظرہ کا بازار گرم ہو۔ بعض اوقات اہل فہم و انصاف اور طالبین حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں اور بدون بحث کے تسلی نہیں ہوتی۔ اس لیے فرمادیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقے سے تہذیب، شائستگی، حق شناسی اور انصاف کے ساتھ بحث کرو۔ اپنے حریف مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو۔ خواہی خواہی دل آزار اور جگر خراش باتیں مت کرو، جن سے قضیہ بڑھے اور معاملہ طول کھینچے۔ مقصود تفہیم اور احقاق حق ہونا چاہیے، خشونت، بداخلاقی، سخن پروری اور ہٹ دھرمی سے کچھ نتیجہ نہیں۔

طریق دعوت و تبلیغ میں تم کو خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا چاہیے۔ اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ کس نے مانا، کس نے نہیں مانا۔ نتیجہ کو خدا کے سپرد کرو۔ وہ ہی راہ پر آنے والوں اور نہ آنے والوں کے حالات کو بہتر جانتا ہے۔ جیسا مناسب ہوگا، اُن سے معاملہ کرے گا۔“ (تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی)

ان تشریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کا منشا یہ ہے کہ اہل ایمان تمام انسانوں کو ’اللہ کے راستے‘ کی طرف بلائیں اور اس فریضے کی انجام دہی میں ’حکمت‘ اور ’موعظتِ حسنہ‘ سے کام لیں۔ ضرورت پڑنے پر احسن انداز میں مباحثہ کرنے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن قرآن مجید نے کہیں بھی اہل ایمان سے یہ نہیں کہا ہے کہ وہ گم راہی میں پڑے ہوئے افراد کے ساتھ ڈائیلاگ کریں اور حق اور باطل کے درمیان کسی ’سمجھوتے‘ پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

دین کا موضوع

اس ضمن میں اس سوال پر بھی غور کرنا چاہیے کہ دین کا موضوع کیا ہے؟ بہ الفاظِ دیگر دین یا مذہب کن سوالات سے بحث کرتا ہے؟ دین کے موضوع کے تین بنیادی پہلو ہیں:

(الف) تصورِ کائنات اور تصورِ انسان

(ب) انسان کی فلاح اور نجات کا راستہ

(ج) قانونِ الہی یا شریعت

دین یہ بتاتا ہے کہ یہ کائنات کیا ہے؟ کیسے وجود میں آئی؟ اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی تخلیق سے خالق کا منشا کیا ہے؟ کائنات کی موجودات کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے؟ اور ان سب کا اپنے خالق سے کیا تعلق ہے؟

دین کے 'موضوع' کا ایک اہم جز خود 'انسان' ہے۔ انسان کی پوزیشن کائنات میں کیا ہے؟ اس کا دوسری مخلوقات سے کیا تعلق ہے؟ موت کے بعد انسان کو کن حالات سے سابقہ پیش آئے گا؟ انسان آزاد ہے یا مجبور؟ اور وہ ذمہ دار اور جواب دہ ہے یا جواب دہی سے بے نیاز ہے؟ اسی طرح دین اس اہم سوال سے بحث کرتا ہے کہ انسان کی فلاح کا راستہ کیا ہے؟ وہ قدریں کیا ہیں جن کو اُسے زندگی کی بنیاد بنانا چاہیے؟ اخلاقی اچھائی اور برائی کا معیار کیا ہے؟ فرد کس طرح اخلاقی و روحانی ترقی کر سکتا ہے اور اپنی کم زوریوں پر قابو پا سکتا ہے؟ خالق کی رضا و قرب کے حصول کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ پھر دین کا موضوع یہ بھی ہے کہ انسانوں کے لیے اور انسانی معاشرے کے لیے الہی ہدایات کیا ہیں؟ خالق کائنات نے کن کاموں اور چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے اور کن کو حلال؟ اس کے قوانین اور ضوابط کیا ہیں؟ وہ حدود کون سی ہیں جن کے اندر انسانوں کو کام کرنا چاہیے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن سے دین اور مذہب بحث کرتا ہے۔ اب کیا ان سوالات میں کسی کا جواب بھی اس طریقے سے دیا جاسکتا ہے کہ پہلے انسانوں کے مختلف گروہ قیاس آرائیاں کر کے اور گمان کے تکیے لڑا کر کچھ 'جوابات' تجویز کر لیں اور پھر آپس میں 'ڈائلاگ' کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کریں؟

یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے۔ ان بنیادی سوالات کی نوعیت تو یہ چاہتی ہے کہ خود خالق کائنات کی طرف سے ان کا جواب ملے اور صاف، واضح اور متعین صورت میں ملے۔

قرآن کا موقف اس سلسلے میں یہی ہے۔ خالق کائنات اپنے بندوں کو یقین دلاتا ہے کہ:

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (ایل: ۱۲)

”بے شک ہدایت دینا ہمارے ذمہ ہے۔“

حاملین کتاب کی ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا ہے۔ اُس نے اُن کو اس امتحان میں نہیں ڈالا ہے کہ وہ بہ طور خود حقیقت کی تلاش کریں اور اگر یہ تلاش مختلف گروہوں کو مختلف نتائج تک پہنچادے تو پھر آپس میں ڈایلاگ کریں۔ اس کے برخلاف اس نے راہِ راست اپنی کتاب نازل کر کے واضح کر دی ہے اور انسانوں کو دعوت دی ہے کہ اس کتاب پر ایمان لائیں اور اس کی پیروی کریں۔ چنانچہ حاملین کتاب (امتِ مسلمہ) کا کام صرف یہ ہے کہ وہ سارے انسانوں کو کتابِ الہی کی طرف بلا لیں اور خود اس کتاب کے مطابق اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو استوار کریں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّٰسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شٰهَدًاۙ عَلٰى النَّاسِ
وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شٰهِيْدًاۙ (البقرہ: ۱۴۳)

”اس طرح ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔“

اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ کی طرف بلانے کا کام اس مستعدی کے ساتھ کریں کہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کے لیے اللہ کی پکار کو سننا ممکن ہو سکے اور وہ یہ کہہ سکے:

رَبَّنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِيۤى۟ لِلْاِيْمَانِۙ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْۚ فَاٰمَنَّاۙ
رَبَّنَاۤ فَاَعْفُرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَاۙ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِۙ

(آل عمران: ۱۹۳)

”اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں اُن سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔“

کلمہ سوا

قرآن مجید میں اہل کتاب سے کہا گیا ہے کہ وہ ’کلمہ سوا‘ (مشرک بات) کی طرف آئیں۔ اس کو بعض لوگوں نے ’ڈائلاگ‘ کے مماثل سمجھا ہے۔ اس لیے قرآن مجید کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ’کلمہ سوا‘ کیا ہے؟ متعلقہ آیت یہ ہے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعٰلَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُنْشِرَكَ بِهٖ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوْا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

(آل عمران: ۶۴)

”کہو: اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ”ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔“ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے ہیں)۔“

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یعنی ایک ایسے عقیدے پر اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے۔ تمہارے اپنے انبیاء سے یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمہاری اپنی کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے۔“

(سورہ آل عمران، تفہیم القرآن: جلد ۱ حاشیہ ۵)

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:

”حضور ﷺ نے جب وفدِ نجران سے کہا اَسْلِمُوا (مسلم بن جاؤ) تو کہنے لگے اَسْلَمْنَا (ہم مسلم ہیں)۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی طرح اُن کو بھی مسلم ہونے کا دعویٰ تھا۔ اسی طرح جب یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید پیش کی جاتی تو کہتے کہ ہم بھی خدا کو ایک کہتے ہیں (بلکہ ہر مذہب والا۔ کسی نہ کسی رنگ میں۔ اوپر جا کر اقرار کرتا ہے کہ بڑا خدا ایک ہی ہے) یہاں اسی طرف توجہ دلائی گئی کہ بنیادی عقیدہ (خدا کا ایک ہونا اور اپنے کو مسلم ماننا) جس پر ہم دونوں متفق ہیں، ایسی چیز ہے جو ہم سب کو ایک کر سکتا ہے، بشرطے کہ آگے چل کر اپنے تصرف اور تحریف سے اس کی حقیقت کو نہ بدل ڈالیں۔

ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح زبان سے (خود کو) مسلم و موحد کہتے ہو، حقیقتاً و عملاً بھی اپنے کوتاہی خدائے وحدہ لا شریک لہ کے سپرد کر دو۔ نہ اس کے سوا کسی کی بندگی کرو، نہ اس کی صفاتِ خاصہ میں کسی کو شریک ٹھہراؤ، نہ کسی اور عالم، فقیر، پیر، پیغمبر کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو صرف ربِ قدیر کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ مثلاً کسی کو اس کا بیٹا پوتا بنانا، یا نصوصِ شریعت سے قطع نظر کر کے۔ محض کسی کے حلال و حرام کر دینے پر۔ اشیاء کی حلت و حرمت کا مدار رکھنا..... یہ سب امور دعوائے اسلام و توحید کے منافی ہیں۔“

(تفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ)

مفسرین کی ان تشریحات سے معلوم ہوا کہ کلمہ سوا کا منشا یہ نہ تھا کہ جن گم راہیوں میں اہل کتاب مبتلا تھے اُن میں اور اسلام کے پیش کردہ اصولوں میں۔ کوئی بیچ کی راہ اختیار کر کے۔ سمجھوتہ کر دیا جائے، بلکہ منشا یہ تھا کہ اہل کتاب کو اس ’تناقض‘ (Inconsistency) کی طرف توجہ دلائی جائے جس میں وہ مبتلا تھے۔ ایک طرف تو وہ توحید کے ماننے کا دعویٰ کرتے تھے، مگر دوسری جانب انھوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا تھا اور اپنے ’جبار و رہبان‘ کو حلال و حرام کے اختیارات دے رکھے تھے (جب کہ قانونِ سازی اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا حق

ہے)۔ 'کلمہ سوا' کا تذکرہ کر کے اہل کتاب سے کہا گیا کہ جس توحید کو ماننے کا تم دعویٰ کرتے ہو، اُس کے منافی جو باتیں تمہارے عقیدے اور عمل میں موجود ہیں، ان سے باز آ جاؤ۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اللہ کے فضل سے ہم مسلمانوں کا عقیدہ و عمل اس تناقص سے پاک ہے۔ ہمارے عقیدے میں کوئی ایسی آمیزش نہیں ہوئی ہے، جو توحید کے خلاف ہو اور اپنے عمل کو ہم نے ہر شرک سے پاک رکھا ہے۔

مغربی اصطلاحات سے اجتناب

Interfaith Dialogue ایک فتنہ انگیز اصطلاح ہے، جو مسلمانوں کے ذہن کو 'دعوت' کے بجائے غیر مسلموں کے ساتھ ایک 'کارِ عبث' میں شرکت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اکثر مغربی اصطلاحوں کا معاملہ یہی ہے کہ وہ حالات کے درست تجزیے میں معاون ہونے کے بجائے 'انتشارِ فکر' پیدا کرنے کا کام کرتی ہیں۔ امتِ مسلمہ کے لیے موزوں یہی ہے کہ وہ مغربی اصطلاحات سے اجتناب کرے اور تحقیق اور تجزیے کے لیے خود ایسی اصطلاحات دریافت اور تجویز کرے جو حقائق کی درست عکاسی کرتی ہوں۔